شرح حکایاتِ عثمانی
جلد نمبر ۱
ملک محمد عثمان

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

رَّبِّ زِدۡنِي عِلۡمًا

میرے پروردگار! مجھے علم میں اور ترقی عطا فرما

باقی ایں گفتہ آید بے زبان
در دل ہر کس کہ دارد نور جان

حضرت مولانا رومیؒ

اس کے علاوہ جو باقی ہے وہ بغیر بولے سنا جائے گا
ہر اس دل میں جہاں روح کا نور موجود ہے

کتاب کا نام : شرح حکایاتِ عثمانی

مصنف : ملک محمد عثمان

ادارت : محمود انور

پہلا ایڈیشن : اپریل 2023

ISBN : ISBN 978-627-7523-05-3

دارالحکمۃ الخالدیہ

مکان نمبر 91 ویلی ویو روڈ رفیع بلاک فیز 8 بحریہ ٹاؤن راولپنڈی

ملک محمد عثمان: صدر

محمود انور : نائب صدر

info@dhk.com.pk & admin@dhk.com.pk

www.dhk.com.pk

darulhikmatulkhalidiya@

https://youtube.com/channel/UC8aUqamHhZjCD-vT7gzisg

+92-336-5920218, +92-315-6468475

مقدمہ الکتاب

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَن لَّا نَبِیَّ بعدہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ گذشتہ سال حکایاتِ عثمانی اردو ایڈیشن کی دارالحکمۃالخالدیہ کے پلیٹ فارم سے نہایت کامیابی کے ساتھ اشاعت ہوئی اور ملک بھر میں اسکے نسخوں کی توزیع کا مرحلہ بھی احسن طریقے سے طے کیا گیا۔ ہمارے قارئین میں بفضلِ تعالیٰ ہر عمر اور طبقے کے افراد شامل تھے، جن میں کثیر تعداد میں سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کرام اور طلباء بھی تھے۔ کچھ لوگوں نے اِس کتاب کی عرفانی اور اخلاقی جہت کی تعریف کی جبکہ بعض نے اسے محض بچوں کی کی کتاب سمجھا۔ یہ دونوں موقف ہمارے لئے حوصلہ افزاء تھے۔ کیونکہ ہماری اِس کتاب کی اشاعت کا بنیادی مقصد حقائق کو سہل ترین انداز میں بیان کرنا اور اسکی شرح اور تاویل کو قارئین کی استعداد اور جستجو پر چھوڑ دینا تھا۔

تاہم بیشتر احباب کی خواہش پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اِس کتاب کی کسی حد تک شرح ضرور کی جائے تاکہ کتاب میں بیان کیے گئے موضوعات کے مزید دریچے واہوں اور ہمارے قارئین اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب حکایاتِ عثمانی کی شرح کا پہلا والیم ہے، جس میں پہلی پچاس حکایات کی شرح کی گئی ہے۔

دو باتیں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہیں۔ایک یہ کہ اِس کتاب میں بیان کی گئی شرح یقیناً حتمی نہیں ہے اور یہ ہر خاص موضوع کے صرف ایک یا چند پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالتی ہے۔ دوسری یہ بات کہ گہرے روحانی علوم ہماری اسلامی روایت میں ہمیشہ رمزیہ طور پر ہی بیان کئے جاتے ہیں۔ باذوق افراد کے لئے یہ رموز ان کے ذوق کے لئے محرک ثابت ہوتے ہیں اور یوں وہ مزید روحانی علوم پڑھنے اور اساتذہ کی طرف بڑھنے کی توفیق حاصل کرتے ہیں۔

مجھے اپنی کم مائیگی کا پوری طرح احساس ہے اور اللہ تعالی کے حضور اس کتاب میں سرزد ہوئی ہر غلطی کی معافی کا طلبگار ہوں۔ ہمیشہ کی طرح قارئین کی طرف سے دیے گئے مشوروں اور اصلاح کو تہہ دل سے قبول کیا جائے گا۔

ملک محمد عثمان

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب شرح حکایات عثمانی سال 2022 کو اوائل سے شروع ہونے والی ہماری کاوشوں اور محنت کا ثمر ہے جب ہمارے فالورز نے ہمیں حکایات عثمانی کی شرح بیان کرنے کے لئے کہا جسے ہم نے اپنے یوٹیوب چینل کے ذریعے "شرح حکایات عثمانی" کے عنوان سے پیش کیا۔

اس کتاب "شرح حکایت عثمانی" کی مثال ایسے ہی ہے جیسے گلاب کی کلی سے پھول بننے کا عمل۔ایک لحاظ سے حکایات عثمانی کی مختصر حکایتوں کی کلیوں کو اس کتاب میں پھول کی صورت میں کھول دیا گیا ہے اور یوں اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ حکایات ویسے ہی کھل گئی ہیں جیسے گلاب کی کلی کھل کر اپنی خوشبو اور خوبصورتی اپنے ارد گرد بکھیرتی ہے۔جیسا کہ اس کتاب میں واضح ہے مختلف مواقع پر قرآن و حدیث کے نصوص ، مولانا جلال الدین رومیؒ اور علامہ اقبالؒ کے افکار سے استنباط کیا گیا ہے جو اس کتاب کے موضوعات کو مزید جاندار بناتا ہے۔

حسبِ روایت ملک صاحب نے اس کتاب کو بھی ممکنہ حد تک عام فہم زبان میں بیان کیا ہے تاکہ کثیر تعداد میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ اس سے بہرہ مند ہو سکیں۔میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ قارئین ہماری اس کاوش سے مستفید ہوں اور اس کتاب کے مطالعہ کے نتیجے میں زندگی گزارنے کے مزید سنہری اصولوں اور طریقوں کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائیں۔

محمود انور

فہرست حکایات

دنیاپور کا سکول

متن حکایت۔

دنیا پور ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا شہر ہے جو نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے مشہور ہے بلکہ اس میں روزگارِ حیات کے گوناگوں طریقے اور مواقع بھی موجود ہیں۔

اسی دنیا پور کے ایک سکول میں پہلی سے لے کر دسویں تک کلاسیں تھیں۔ ہر کلاس کے لیے الگ الگ کمرہ تھا۔ مختلف اساتذہ اپنے اپنے مضامین پڑھاتے، تاہم کچھ اساتذہ
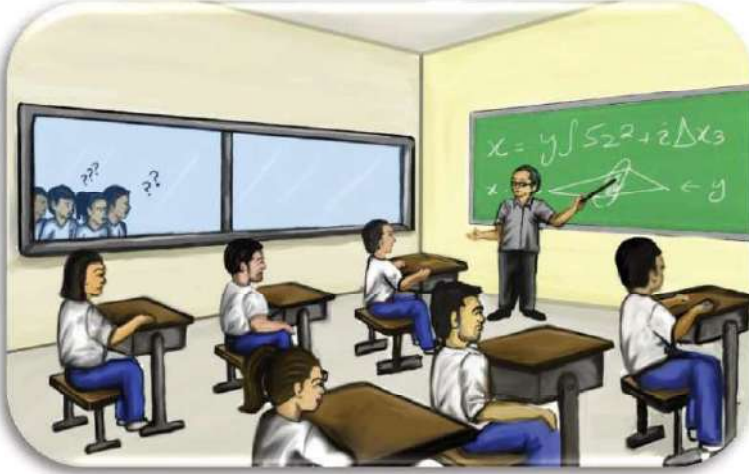
ایسے بھی تھے جن کو ایک سے زیادہ مضامین پر دسترس حاصل تھی۔

ایک دن پہلی کلاس کے کچھ طالب علم دسویں کے کلاس روم کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اندر جھانکنے لگے۔ اندر کلاس ہو رہی تھی اور ایک ٹیچر دسویں جماعت کے بچوں کو پڑھا رہا تھا۔

چھوٹی جماعت کے بچے کافی دیر تک کھڑکی سے لگے سنتے رہے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ حیران ہو کر اپنی کلاس میں واپس چلے گئے۔

اگرچہ دنیاپور کے اس سکول میں پہلی سے دسویں تک تمام بچوں کا سکول یونیفارم ایک ہی تھا لیکن ان کا فہم اپنی اپنی کلاس کے حساب سے درجہ بہ درجہ مختلف تھا۔

شرح حکایت۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ حکایات رمزیہ انداز میں لکھی گئی ہیں اور ہر حکایت انسان کے حوالے سے اس کے ذہنی، نفسیاتی، نظریاتی، معاشرتی اور روحانی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ یوں ایک مختصر شرح میں اس کتاب کی کسی ایک حکایت کی جو کہ تہہ در تہہ معارف پر مبنی ہے پوری طرح سے شرح نہیں کی جاسکتی، بلکہ اُس کے چند پہلوؤں کو ہی اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

سب سے پہلے اس حکایت میں دنیا کو، دنیاپور کا سکول کیوں کہا گیا ہے۔ سکول کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسان تعلیم حاصل کر کے اپنے شعور کو ترقی دے۔ یہ دنیا کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں ہر چیز مکمل ہے بلکہ یہاں لوگ آزمائش اور ترقی کے لیے آتے ہیں ۔اس دوران کچھ لوگ تنزل کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔

دنیا آخرت کے مقابلے میں یعنی یہ زندگی بعد کی زندگی کے مقابلے میں ہمیشہ پیچھے ہوتی ہے اور آخرت اس سے آگے۔ یوں اس زندگی سے اس کامیاب زندگی کی طرف جانے کے لیے انسان کو ترقی کرنا ہوتی ہے۔ ہم نے یہ بتایا کہ پہلی سے دسویں جماعت تک سب طالب علم یعنی دنیا کے سارے لوگ ایک جیسے نہیں بلکہ عقل و شعور کے مختلف مدارج پر ہیں۔

سب لوگوں کا عقل و شعور کے ایک جیسے مدارج پر نہ کھڑے ہونا ایک بڑی خدائی سکیم ہے۔

یہ دنیا کی زندگی اور ارض و سماوات سب حرکت میں ہیں جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ،

"یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید"
"آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون"

یہ جہاں ناتمام ہے یعنی آسمانوں کو وسعت مل رہی ہے اور اسی وسعت پذیری اور آسمانوں کے پھیلاؤ میں انسان بھی ترقی کر رہا ہے۔اس سے ہمیں یہ بات پتہ چلی کہ لوگوں کے عقل و فہم میں جو فرق ہے یہ کوئی ایسا دائمی یا فکسڈ فرق نہیں ہے بلکہ انسان کو مواقع حاصل ہوتے ہیں جس سے وہ اپنی عقل و فہم کو ترقی دے سکتا ہے۔

اسی اصول پر میں یہ بتاتا چلوں کہ خالق کائنات کی اسکیم میں استعداد اور فہم کا یہ فرق ایک بڑی مصلحت پر مبنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دفاتر میں لوگ مختلف درجوں میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔ایک سکیل سے لے کر بائیس سکیل تک لوگ اپنی اپنی استعداد اور تعلیم کے مطابق درجہ بدرجہ تقسیم ہیں۔ ایسے ہی ہم کسی کارخانے میں دیکھتے ہیں کہ جنرل مینجر سے لے کر مزدور تک اپنی اپنی جگہ پر کام کر رہے ہوتے ہیں—یہ سب اسی لیے ممکن ہے کہ لوگوں کی استعداد اور عقل و فہم میں فرق ہے۔

یہی اصول ایک اور پہلو سے لوگوں کے مابین معاملات سے متعلق ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آیا ہے۔

"کلموالناس علی قدر عقولھم"

"لوگوں سے اُن کی عقلوں کے مطابق بات کرو"

یعنی جب لوگوں سے ہم معاملہ کریں تو ہمارے پاس ایسی حکمت ہونی چاہئے جس سے ہم یہ دیکھ سکیں کہ ہمارا مخاطب کس لیول پر کھڑا ہے اور ہم کس لیول پر کھڑے ہیں-یہ ایک قسم کی معرفت کی بات ہے کہ جب آپ لوگوں سے معاملہ کریں تو اُن کے فہم اور شعور کا ادراک رکھتے ہوئے کریں۔

اگلی بات یہ ہے کہ یہ اصول ہمارے اوپر کونسی ذمہ داری ڈالتا ہے۔ مثلاً جب ہم اس اصول کو دیکھتے ہیں کہ کائنات کی گریٹر سکیم کے مطابق مختلف لوگ عقل اور شعور کے مختلف مدارج پر کھڑے ہیں تو مجھے سامنے والے شخص سے اتنی ہی توقع کرنی چاہیے جتنی عقل اور فہم وہ رکھتا ہے۔اخلاقی تعلیم میں اسی وجہ سے صبر کی تلقین کی جاتی ہے اور غصے کو پی جانے کا حکم ہے۔ مثلاًاگر ایک آدمی کا میرے ساتھ برتاؤ ویسا نہیں جیسا کہ میں اپنے منصب کے حساب سے توقع رکھتا ہوں تو پھر صبر کرنا میرے لیے ضروری ہے۔اس لیے کہ میں جس کائنات میں رہ رہا ہوں یہ کائنات ایک حکمت پر کھڑی ہے اور میرے لیے ضروری ہے کہ میں بطور ایک فرد اس عظیم کائنات کے حکمت کے اصولوں کی پاسداری کروں۔

اسی اصول کی مزید وضاحت ،مساوات اور مذہبی رواداری کی تعلیم ہے۔۔ مثلاً ایک چالاک آدمی دنیاوی لحاظ سے اگر زیادہ عقل رکھتا ہے تو وہ اپنے لیے زیادہ مادی وسائل اکٹھے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اگر کائنات کے اس فہم اور استعداد کے فرق والے بنیادی اصول پر ایمان رکھتا ہو تو وہ چاہے گا کہ وہ کم استطاعت والے لوگوں کو بھی آگے بڑھنے

کا موقع دے۔رواداری اور مساوات کو قائم رکھنے کے لیے بڑی عقل اور استعداد والے آدمی کو زیادہ قربانی دینی چاہیے۔اس طرح یہ اصول ہمیں قربانی کے لیے بھی آمادہ کرتا ہے۔

یہ اس حکایت کے چند بنیادی اسباق ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں لوگوں کی عقل، فہم اور استعداد کا فرق کسی انا کی برتری کا پیغام نہیں دیتا بلکہ یہ بتاتا ہے کہ یہ ایک خدائی سکیم ہے جس کا ضروری تقاضہ لوگوں کے منصب کو پہچاننا اور معاشرے میں رواداری اور مساوات کو قائم رکھنا ہے۔

ناریل، بندر اور لومڑی

متن حکایت۔

ایک دن ایک لومڑی کا ایک جزیرے سے گزر ہوا جہاں کثیر تعداد میں ناریل کے درخت تھے۔ اس نے دیکھا کہ بندر ناریل کو توڑتے ہیں اور ان کی گری نکال کر کھا جاتے ہیں۔ جبکہ ناریل کے چھلکوں کو ادھر ہی پھینک دیتے۔

یہ دیکھ کر لومڑی نے ناریل اکھٹے کرنے شروع کر دیے۔ اس نے ایک جھاڑی کے
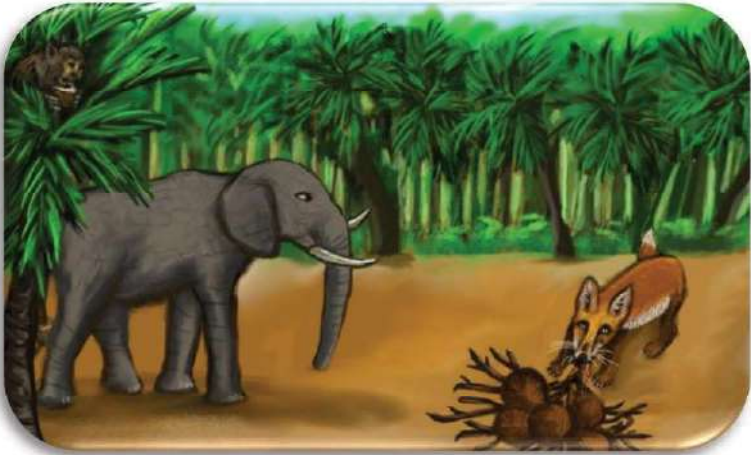
قریب ناریل کا ڈھیر لگالیا۔ اب اسے فکر لاحق ہوئی کہ ناریل کے ڈھیر کو اپنی کھوہ تک کیسے پہنچائے۔ اسے ایک ترکیب سُوجھی، اس نے اپنے منہ سے ایک گھنی جھاڑی کو توڑا، تمام ناریل اس جھاڑی کے اوپر رکھے اور اسے اپنی کھوہ کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

اس عمل سے اس کا منہ اور پنجے زخمی ہو گئے اور جسم ڈھول مٹی سے اٹ گیا۔ الغرض اس کا برا حال ہو گیا۔ راستے میں اس کی ملاقات ایک دانا ہاتھی سے ہوئی۔ ہاتھی نے لومڑی سے کہا تم یہ ناریل کہاں لے جا رہی ہو۔ لومڑی نے جواب دیا؛ میں نے بندروں کو ناریل کھاتے دیکھا ہے اور میں انہیں اپنی کھوہ میں لے جا رہی ہوں۔ ہاتھی نے کہا بندر تو بس اس کی گری ہی کھاتے ہیں۔ اس کے چھلکوں کا بوجھ کب اٹھاتے ہیں۔ اور لومڑیاں تو ناریل کھاتی ہی نہیں، پھر یہ بے کار مشقت کس کام کی۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ناریل کو خالص علم کے بیان کے لیے استعارہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اگر آپ ناریل کو دیکھیں تو سب سے اوپر ایک بڑی سخت چھلکے کی تہہ ہوتی ہے اس کے نیچے ایک اور خول ہے جو لکڑی کی طرح کا ہوتا ہے۔ جب اس خول کو توڑتے ہیں تو اس کے نیچے ناریل کا پھل ہوتا ہے جسے اردو میں کھوپرا یا گری کہتے ہیں۔ اس گری میں اگر ہم سوراخ کریں تو اس کے اندر ناریل کا پانی ہوتا ہے جو ایک انتہائی غذائیت سے بھرپور چیز ہے۔

ناریل کی اس ترتیب میں گہری معرفت ہے۔ جس طرح ناریل کا پھل یا وہ پانی جو غذائیت سے بھرپور ہے اس کے اوپر خول چڑھے ہوئے ہیں ایسے ہی اس کائنات کے علوی حقائق اور معرفت کے حصول کے رستے پر تہہ در تہہ خول چڑھے ہوئے ہیں اب جو لوگ علوم و معرفت کی ظاہری شکل پر کھڑے ہوتے ہیں یعنی وہ ناریل کے اوپر والے چھلکوں کی سٹیج پر ہوتے ہیں ایسے لوگوں میں غیر ضروری مسابقت، نفرت اور

ایک طرح کی لڑائی کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ علوم اور معرفت کی پرتوں کو کھولتے جاتے ہیں اور یوں ناریل کی انتہائی غذائیت یعنی معرفت کے انتہائی خالص مقام پر پہنچ جاتے ہیں وہ لوگ معاشرے میں امن، محبت، رواداری اور مساوات قائم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ علوی حقائق کی معرفت دراصل اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک بڑی نعمت ہے۔ ہم جانتے ہیں ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اس لیے جب کوئی آدمی حقیقی معرفت پر پہنچے گا تو اس کو یہ کائنات اللہ کا کنبہ نظر آئے گی اور امن، پیار اور محبت پھیلے گا۔

اس حکایت میں دوسری چیز یہ دکھائی گئی ہے کہ وہ لومڑی جو سارے ناریل اکھٹے کر کے اپنی کھوہ میں لے کر جا رہی ہے یہ ناریل اس کے کسی کام کے نہیں ہیں۔ وہ ان کو بس ظاہری پوزیشن اور زینت کا ذریعہ بنانا چاہتی ہے۔ ناریل کا پھل یا گری کھانا اور اس میں موجود غذائیت سے بھرپور پانی پینا اس لومڑی کے مزاج میں شامل ہی نہیں۔

ایسے لوگ جو علم کو ظاہری زینت بنانا چاہتے ہیں اور اُس کو اپنے قبضے میں لے کر بس اپنے جسم پر سجا لیتے ہیں وہ اس معاشرے میں بہتر کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔ علم کا اصلی مقصد تو دل کی دنیا آباد کرنا ہے جیسا کہ مولانا رومؒ کا مشہور شعر ہے۔

"علم را بر تن زنی مارے بود

علم را بر دل زنی یارے بود"

یعنی اگر آپ علم سے ظاہری زینت حاصل کرنا چاہو گے اور اُس کو تن پرستی اور بڑے بڑے القابات کے لیے استعمال کرو گے تو وہ سانپ بن جائیگا اور معاشرے میں زہریلے

اثرات پیدا کرے گا۔اس کے بر عکس اگراس کو دل سے لگاؤ گے ،دل کی دنیا آباد کرو گے تو وہ دوست بن جائے گا۔یعنی وہ امن، محبت اور فلاح کا باعث بن جائیگا۔

انہی حقائق کی معرفت کے پیش نظر اور دنیا کے نظام کے اندر چھپی حکمت کے پیش نظر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک مشہور فرمان ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ہے

"اللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ"

"یااللہ مجھے اشیاء کے حقائق دکھا جیسا کہ وہ اپنی حقیقت پر ہیں"

اس کا مطلب ہے کہ اشیاء کی اصل حقیقت تک پہنچنا اور اُن کو سمجھنا انبیاء کی تعلیمات میں سے ہے۔

خودستان کے گھر

متن حکایت۔

خودستان ایک ریاست ہے جس میں حکومت نے خبردار کررکھا ہے کہ گھروں کے نقشے ایک خاص طرز پر ہوں گے۔ جن گھروں کی کنسٹرکشن منظور شدہ نقشے کے مطابق نہیں ہوگی ان گھروں کو کمپلیشن سرٹی فکیٹ نہیں دیا جائے گا۔

ایک گھر کے لیے معیاری نقشہ کیا ہونا چاہیے اس پر بہت بحث ہوئی اور پھر کافی سوچ بچار کے بعد ایک بنیادی نقشہ بنایا گیا۔ یہ نقشہ ریاست کے تمام گھروں کے لیے بطور ریفرنس استعمال ہوگا۔ اس نقشے میں لازمی قرار دیا گیا کہ گھر کے پچھلے کمروں اور داخلی گیٹ کے درمیان ایک خاص فاصلہ ہونا چاہیے۔ داخلی گیٹ ایک کشادہ صحن میں کھلے گا۔ اندر آنے والا کوئی بھی شخص پہلے صحن میں داخل ہوگا، پھر صحن عبور کرکے کمروں کے آگے بنے برآمدہ تک پہنچے گا اور پھر برآمدے سے گزر کر پچھلے کمروں کے

دروازے تک آئے گا۔یوں پچھلے کمرے تک پہنچنے کے لیے چار رکاوٹیں تھیں۔داخلی گیٹ، کشادہ صحن، برآمدہ اور پچھلے کمرے کا دروازہ۔ان تمام مدارج سے گزر کر ہی کوئی شخص پچھلے کمرے تک پہنچ سکے گا۔

ریاست خودستان کے تمام لوگوں نے اس نقشے کو خوب سراہا کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ نقشہ ان کو گھر میں داخل ہونے والی کسی ناگہانی چیز سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔داخلی گیٹ اور پچھلے کمرے کے درمیان والی رکاوٹیں ان کے لیے فاصلے کا اہتمام کرتی تھیں اور یہ فاصلہ سکون کا باعث تھا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں خودستان سے مراد انسانی شخصیت ہے۔خودستان کی ریاست سے مراد خودی یاانسانی شخصیت کو بڑااور منظم دیکھنا ہے۔انسانی شخصیت اگر سکڑ جائے تو وہ ایک بہت معمولی چیز بن جاتی ہے اور اگر پھیل جائے تو ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہےاوراس کی ترقی کادائرہ انتہائی وسیع ہو جاتا ہے۔
اس حکایت میں ہم نے گھر یعنی انسانی شخصیت کے سٹرکچر میں داخلی دروزہ، صحن، برآمدہ اور پھر پچھلا کمرہ دکھایا۔سب سے پچھلے کمرے سے ہماری مراد انسانی شخصیت کا مرکزی شعوری کنٹرول ہے۔داخلی دروازہ اور اس کے بعد جو مراحل ہیں جیسے صحن، برآمدہ اور پھر پچھلا دروازہ یہ سب مراحل ,وہ جبلی،ذہنی اور نفسیاتی محرکات ہیں جنہیں مرکزی شعور تک بغیر اجازت رسائی نہیں ہونی چاہیے۔
انسانی شعور دماغ پر مقدم ہو۔انسانی ذہن میں داخل ہونے والا حسی ڈیٹا اور جسمانی جبلتوں کے محرکات شعور کو براہ راست متاثر نہ کریں۔بلکہ ان کے اوپر چیکس ہوں

جیسے داخلی گیٹ۔ایک جبلی رجحان داخلی گیٹ سے اجازت لے کر داخل ہو تو پھر اُسے صحن عبور کرنا ہے پھر پچھلے برآمدے میں آنا ہے اور پھر پچھلے کمرے کے دروازے سے اجازت نامہ چاہیے تب جا کر وہ، مرکزی شخصی شعور تک پہنچ سکتا ہے۔یوں اگر انسان اپنی شعوری زندگی کو منظم کر لے تو بے شمار جبلی رجحانات اور ذہنی اور نفسیاتی مسائل پر قابو پا سکتا ہے۔

جب انسان کی شعوری زندگی مضبوط ہوتی ہے تو وہ ایک خاص قسم کے سکون میں داخل ہوتا ہے۔اگر انسان محض اپنے دماغ کے تابع ہو جائے تو بے شمار پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے اور ہر طرح کی سوچیں اُس کو لیے پھرتی ہیں۔اس کی بجائے اگر وہ اپنی اصلی شعوری ذات کو مستحکم کرے اور اپنے شعور پہ کھڑے ہو کر خیالات اور جبلتوں کا مقابلہ کرے تو باقی مخلوق سے آزاد اور ممتاز ہو جاتا ہے۔

اس عمل کو آپ تزکیہ بھی کہہ سکتے ہیں یعنی صفات مذمومہ اور بری عادات سب ایک نچلے لیول کے جبلی اور دماغی محرکات ہیں۔تزکیہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے ذاتی شعور کو ایسے ترتیب دینا چاہئے کہ ہم اپنے جسم کی خواہشات اور نفسیاتی دباؤ سے بالا تر ہوں۔جس کو ہم تزکیہ نفس کہتے وہ بھی جبلی تقاضوں اور جینیاتی حصار سے مقابلہ کرنے کا نام ہے۔جب بندہ اپنی شعوری ذات کو مستحکم کرتا ہے تو اس کو اپنی جینیاتی اور ماحولیاتی زندگی کے ساتھ رہنے کا سلیقہ بھی آتا ہے-ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کو اس کا وراثتی جینیاتی ڈیٹا اور ماحولیاتی اثرات اپنی مرضی سے جہاں چاہئے بہا لے جائیں۔

جسے ہم تصوف میں عشق حقیقی کہتے ہیں وہ بھی دراصل شعور کے اعلی مراتب پر کھڑے ہونا ہے۔مولانا رومؒ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

"ہر کرا از عشق جامہ چاک شد

اوز حرص و عیب کلی پاک شد"

جس کسی کا عشق نے جامہ چاک کر دیا، کپڑے پھاڑ دیے یعنی وہ عشق حقیقی میں مبتلا ہو گیا تو وہ ہر طرح کے عیب سے پاک ہو گیا۔ عشق حقیقی بھی آدمی کو اس کے نچلے درجے کی خواہشات، جذبات اور نفسیات پہ غلبہ نصیب کرتا ہے۔

جب کوئی عشق حقیقی میں مبتلا ہوتا ہے وہ نچلے درجے کے سارے تقاضے چھوڑ کے اوپر کی طرف پرواز کرتا ہے- یہ عشق اسے اس کے رب کے قریب کر دیتا ہے اور پھر درمیان میں کسی سفلی حقیقت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی-

مٹی کی بلبل

متن حکایت۔

ایک آرٹسٹ نے مٹی سے ایک بلبل بنائی۔ دور سے دیکھنے والا ہر شخص اس کو اصلی بلبل ہی سمجھتا تھا، تاہم قریب آنے پر معلوم ہوتا کہ وہ ایک مٹی سے بنی نقلی بلبل تھی۔ جس کی ظاہری رنگت تو بلبل کی طرح تھی لیکن بلبل کی اندرونی ذات اور اوصاف کے حوالے سے اس میں کچھ بھی موجود نہ تھا۔

نہ تو اس میں بلبل کا دماغ تھا اور نہ ہی اس کا گل و گلزار سے کوئی تعلق تھا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں مرکزی استعارہ بلبل ہے۔ ایک فنکار نے مٹی کی بلبل بنائی جو کہ اصلی بلبل سے بالکل مختلف تھی۔ دیکھنے میں وہ اصلی کی طرح لگتی تھی لیکن جب قریب سے جا کے دیکھیں تو اصلی بلبل کی طرح نہیں تھی۔ بنیادی طور پر اصلی اور نقلی بلبل میں کیا فرق ہے؟ جو نقلی بلبل ہے وہ مٹی سے بنائی گئی ہے اس کا ظاہری وجود بالکل اصلی بلبل کی

طرح ہے، تاہم اس کے اندر اصلی بلبل والا دماغ ہے نہ ہی اصلی بلبل والا ذوق۔ اسے اصلی بلبل کی طرح چہچہانے کا کوئی شوق ہے اور نہ ہی پھولوں اور باغوں کے ساتھ کوئی اُنس۔ گویا وہ ایک ظاہری بلبل ہے اور حقیقت کے اعتبار سے اُس کے اندر بلبل کی کوئی خصوصیات نہیں۔

اسی طرح انسان کی شخصیت کے بھی دو پہلو ہیں، ایک ظاہری پہلو ہے اور ایک باطنی پہلو ہے۔ ان کو ہم جسم اور روح بھی کہہ سکتے ہیں۔ صورت اور معنی بھی کہہ سکتے ہیں۔ صورت اور معنی ایک اصطلاح ہے کہ انسان اور پوری کائنات کی ایک صورت ہے اور ایک معنوی حقیقت۔ انسان کی معنوی حقیقت میں موجود اعلیٰ ذوق کو ہم بلبل کا دماغ اور گل و گلزار سے اُنس کہہ رہے ہیں۔ یہ اعلی ذوق اسے کائنات کے لطیف تر رموز کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ اس کائنات میں رہتے ہوئے اگلے جہان کے رموز کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی جس طرح اس جسم کے ظاہری حواس ہیں اسی طرح باطنی حواس بھی ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

"حس دنیا نردبان ایں جہاں

حس عقبیٰ نردبان آسمان"

جو اس دنیا کے حواس ہیں یعنی اس جسم کے حواس ہیں وہ اس دنیا کی سیڑھی ہے۔ ان پانچ حواس سے ہم جو کچھ اخذ کرتے ہیں وہ سب اس دنیا کے بارے میں ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ حس عقبیٰ نردبانِ آسمان، یعنی جو ان پانچ حواس کے علاوہ حواس ہیں وہ انسان کی روحانی استعداد اور اعلیٰ ذوق ہے۔ وہ ایسی سیڑھی ہے جس سے انسان آسمانی اُمور کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا ہے۔ روحانی حواس کی جسمانی حواس پر ایسی ہی برتری ہے جیسے روح کی جسم کے اوپر برتری ہے۔ مولانا روم کا ایک بہت مشہور شعر ہے۔

"بادہ از مست شُدنے ما از و

قالب از ما ہست شُدنے ما از و"

کہ قالب یعنی جسم ہماری وجہ سے قائم ہے، ہم جسم کی وجہ سے قائم نہیں ہیں-یعنی ہماری معنوی حقیقت کو ظاہری حقیقت پر برتری حاصل ہے۔ شراب ہماری وجہ سے مست ہے نہ کہ ہم شراب کی وجہ سے مست ہیں-یعنی ہماری روحانی ذات کو ہماری جسمانی ذات پر برتری حاصل ہے۔

ایسی بلبل جو مٹی کی بلبل ہے، جس میں کوئی ذوق نہیں ہے-جسے کائنات کے لطیف رموز کو سمجھنے کا شوق نہیں ہے-ایسی شخصیت بے حقیقت سی شخصیت بن جائیگی-اس حکایت میں بنیادی طور پر جو پیغام ہم دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ظاہری حقیقت کے ساتھ ساتھ اپنی باطنی حقیقت کو بھی سمجھنا چاہیے، جب وہ اپنی باطنی حقیقت کی طرف جائے گا تو کائنات کے لطیف رموز کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرے گا۔

میاں محمد بخشؒ کا مشہور شعر ہے۔

"قدر پھُلاں دی بلبل جانے صاف دماغاں والے

قدر پھُلاں دی گدھ کی جانے مردے کھاون والے"

گدھ کے اندر پھولوں کے ذوق کی صلاحیت نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے دماغ کو بلبل کے دماغ کی طرح بنائے-چونکہ انسان جنت سے نکالا گیا ہے تو پھر اس کا آخری ٹھکانہ بھی جنت ہونا چاہیے-ہم جنت کو باغ سمجھتے ہیں تو ہمارے اندر جنت میں رہنے والی بلبل کی خصوصیات بھی ہونی چاہیے-یعنی ہمارے اندر جو کثافت ہے اس کو لطافت میں ڈلنا

چاہیے اور جتنا جتنا اُس کو ہم لطافت میں ڈالیں گے اُتنا اُتنا ہم حقیقت کے قریب ہوتے جائیں گے۔

متن حکایت۔

ایک بچے کے پاس خوبصورت لٹو تھا۔ لٹو پر کئی طرح کے ڈیزائین بنے ہوئے تھے۔ جب بچہ لٹو کو زور سے گھماتا تو اس گھومتے ہوئے لٹو پر کوئی ڈیزائین واضح نظر نہ آتا۔ ایسے لگتا کہ تیز گھومتے ہوئے لٹو کی اپنی اصلی ذات اس گردش میں

کھو گئی ہو۔

لیکن جب وہی لٹو اس گردش سے باہر نکل آتا اور رک جاتا تو اس کے اصلی خدوخال پھر سے نمایاں ہو جاتے۔

شرح حکایت۔

لٹو سے ہماری مراد انسان ہے یا انسانی شخصیت ہے اور لٹو کے اوپر جو ڈیزائن ہے، پیٹرن ہے اس سے مراد انسانی شخصیت کی مختلف جہات ہیں۔اس کے مختلف اوصاف یا

صلاحیتیں ہیں — بچے کے لٹو کو گھمانے سے مراد انسان کا ناپختہ ادراک یا شعور ہے۔جب بچہ لٹو کو حرکت دیتا ہے تو جس طرح لٹو سے اُس کے ڈیزائن چھپ جاتے ہیں ایسے ہی انسان اپنے ادراک کی ناپختگی کے ساتھ جب اپنی شخصیت یا شخصیت کے کسی پہلو کو حرکت دیتا ہے تو اس انسان سے اس کے اوصاف حمیدہ چھپ جاتے ہیں۔اعلیٰ اوصاف چھپنا شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ انسانی شخصیت یا انسانی شخصیت کی جہت کیا چیز ہے اس کو ہم مثال سے واضح کرتے ہیں مثلاً ایک انسان کی ایگو (انا) کی ایک خاص حد ہوتی ہے۔وہ ایک حد یا حصار میں ہے، وہ جہاں پیدا ہوا جیسے ماحول میں ہے، جیسے ایجوکیشن ہے، جیسے اُس کے خاندانی تعصبات ہیں۔ایسے میں اگر کوئی انسان ایگو سنٹرک ہو کر اپنی انا کو تیزی سے حرکت دیتا ہے تو وہ اپنی موجودہ ایگو کے حصار میں آجاتا ہے۔اب اس سے کیا چھپ جاتا ہے؟ اس سے دوسرے لوگوں کی زندگی، ان کے معاملات، کائنات کا نظام، معاشرے کی اُونچ نیچ، امیر غریب ہونا، لوگوں کا مختلف شعور کے لیول پہ کھڑے ہونا، علم اور ادیان کے بنیادی اصول، یہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔کیونکہ وہ اپنی انا کی حرکت کے حصار میں آجاتا ہے۔

ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں ایک آدمی جو بھرپور مادی زندگی گزار رہا ہے، وہ علم بھی حاصل کرتا ہے تو پیسے کمانے کے لیے ایک پروفیشنل بن جاتا ہے، وہ اس پروفیشنل جدوجہد میں چلتا رہتا ہے۔ وہ اپنے لیے پیسے اکٹھے کرتا ہے، جائیداد بناتا ہے۔جب وہ اس مادی کوشش کو اتنی شدت سے حرکت دیتا ہے تو پھر اس سے انسان اور کائنات کی روحانی جہت نظر انداز ہو جاتی ہے۔وہ آدمی ایک جگہ پہ آکر ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔اُس کے اندر

روحانیت کی کمی اُس کو ستانا شروع کر دیتی ہے-وہ روحانیت کے دب جانے سے غیر متوازن شخصیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

اس حرکت کو ہم اور کئی طریقوں سے بیان کر سکتے ہیں جیسے کہ ایک آدمی کو اپنے خاندان کا تعصب ہے-وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جس خاندان میں پیدا ہوا ہوں وہی سب سے اعلیٰ خاندان ہے۔جب وہ اس خاندانیت کے لٹو کو تیزی سے حرکت دیتا ہے تو پھر باقی لوگوں کے اوصاف اس سے چھپنا شروع ہو جاتے ہیں-اُسے پھر یہ سمجھ نہیں آتی کہ ان باقی خاندانوں کے جو لوگ ہیں اُن کی کیا اہمیت ہے-ایسے ہی اگر کوئی اپنی ثقافت کے تعصب کا شکار ہو گیا تو پھر اس سے دنیا میں موجود بے شمار دوسری ثقافتوں کے اوصاف چھپنا شروع ہو جاتے ہیں-ایسے ہی آپ دیکھتے ہیں کہ جو بندہ کسی خاص مذہب یا فرقے کو اس شدت سے فالو کرتا ہے کہ وہ باقی فرقوں کی مکمل نفی کرتا ہے تو پھر اس سے دین کے یونیورسل اوصاف چھپنا شروع ہو جاتا ہیں-وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی سکیم سے ناآشنا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔کہ تم لوگ اسراف کرنے والے ہو۔عام طور پر اسراف کو ہم پیسے خرچ کرنے کے معاملے میں سمجھتے ہیں۔لیکن اسراف سے مراد انسانی شخصیت کی کسی بھی صلاحیت کو غیر متوازن استعمال کرنا ہے۔یعنی آپ کسی بھی چیز کو جب لے کر چلیں تو اس کے اندر آپ نے عدل اور توازن تلاش کرنا ہے اگر آپ اس توزن کو توڑ دیتے ہیں تو آپ مسرف ہو جاتے ہیں۔

سورۃ فرقان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا

جو رحمان کے بندے ہیں وہ زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں۔

زمین سے مراد پلیٹ فارم ہے یہ جو ہمارا پلیٹ فارم ہے اس پہ ہم نے ایسی حرکت کے ساتھ چلنا ہے کہ ہم اپنی شخصیت کے تمام تر اوصاف کے ساتھ عدل کر سکیں۔ علم و عقل کے ساتھ بھی عدل کر سکیں، اپنی زندگی کی روحانی جہت کے ساتھ بھی عدل کر سکیں۔ہم اپنی شخصیت کے کسی پہلو کو بچے کے لٹو کو گھمانے کی طرح نہ گھمائیں کہ ہم اپنی جسمانیت کو تو قائم رکھیں لیکن اپنے اوصاف حمیدہ اور اپنی روحانی حیثیت سے نا آشنا ہو جائیں۔

متنِ حکایت۔

کسی دیہاتی کے پاس ایک بکری تھی جو کچھ زیادہ ہی کھاؤ قسم کی تھی۔ دن بھر چارہ چرتی مگر اس کا پیٹ نہ بھرتا۔ اسی طرح ایک روز وہ صبح سے شام تک چرتی رہی مگر جیسے اسے جوع البقر کا مرض تھا۔وہ سیر نہ ہوئی۔

سرِ شام اس نے دیہاتی کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں اسے دانوں کی ایک بوری نظر آئی۔ اس نے دانتوں سے بوری میں سوراخ کیا اور دانے کھانے شروع کر دیے۔ ایسے میں حد سے زیادہ دانے کھانے سے اس کا پیٹ پھُول گیا۔ وہ صحن میں واپس آئی اور چکرا کر گر گئی۔ اس

کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

دیہاتی نے یہ ماجرا دیکھا تو ہر ممکن کوشش کی کہ اس کا کوئی علاج کر سکے لیکن بکری قریب المرگ ہو گئی، چناچہ اس کو قصاب خانے لے گیا۔

شرح حکایت۔

ایک بکری سارا دن چرنے کے بعد اپنے مالک کسان کے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور گندم کی بوری سے بے شمار گندم کھا جاتی ہے جس سے اس کا پیٹ پھول جاتا ہے اور وہ قصاب تک پہنچ جاتی ہے—یہ اس بکری کی ہوس ہے۔

یہاں ہوس سے مراد کثیر مقدار میں بے اعتدالی کے ساتھ کسی چیز کا انڈکش (ہڑپ کر لینا) ہے۔اس کثیر مقدار میں اور بے اعتدالی کے ساتھ انڈکشن کو ہم متعدد سطحوں پر بیان کر سکتے ہیں۔

جسمانی لیول پر تو یہ وہی بسیار خوری ہے جس کی مرتکب بکری ہوئی۔یقینا جسمانی اور روحانی صحت کے اعتبار سے بسیار خوری ایک بری عادت ہے۔ مولانا رومؒ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی کم عبادت کر کے تو صوفی بن سکتا ہے لیکن زیادہ کھا کر صوفی نہیں بن سکتا—

مولانا رومؒ کا ایک شعر ہے۔

"از کم خوردن زیرک وہشیار شوی

وز پُر خوردن ابلہ وبے کار شوی"

کہ کم کھانے سے تم زیرک اور ہشیار ہو جاتے ہو، عقلمند بن جاتے ہو چالاک ہو جاتے ہو ،جبکہ زیادہ کھانے سے تم بے وقوف اور بے کار بن جاتے ہو۔

زیادہ اور بے اعتدال انڈکشن کو علمی لحاظ سے دیکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سوشل میڈیا کا دور ہے اور انفارمیشن کا فلو بہت زیادہ ہے اس دور میں جب کوئی آدمی بے اعتدالی اور بے ترتیبی کے ساتھ بے شمار انفارمیشن اپنے دماغ میں انڈکٹ کرتا ہے تو چونکہ یہ

انفارمیشن بے ضبط اور بے ترتیب ہوتی ہے، وہ ایک منظم علم کی شکل اختیار نہیں کرتی، اس لیے ایسے علم کے حامل کسے پختہ نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔

ایسے ہی سیاسی، مذہبی اور روحانی رہنما لوگوں کو اپنی پارٹیز میں کثیر تعداد میں انڈکٹ کرتے ہیں-ایسے میں لوگوں کی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا۔ جب کسی سیاسی پارٹی نے بے شمار لوگوں کو اپنا ممبر بنالیا، کسی مذہبی رہنما نے بے شمار لوگوں کو اپنی پارٹی میں انڈکٹ کر لیا یا کسی روحانی شخصیت نے بے شمار لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا اور انکی تربیت کا باقاعدہ انتظام نہ کیا تو ایسی سرگرمیوں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

" وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْ "

اس کی ایک معنی تو یہ ہے کہ کھاؤ، پیؤاور اسراف نہ کرو یعنی جسمانی لیول پر کھانا پینا مراد ہے اور اس کو اگر وسیع نظریہ سے دیکھیں تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے زندگی کے تمام امور اس طرح انجام دو کہ اس میں تجاوز نہ کرو۔ ان کو نظم اور ترتیب سے انجام دو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں بے شمار حریص بکریاں موجود ہیں اور بے شمار کسان ہیں جن کے کمروں میں گندم کی بوریاں پڑی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نفس کے اس ٹریپ سے بچائے جو ہمیں حریص بکری بنا کر کسی کسان کے کمرے میں موجود بوری کو پھاڑنے اور اس میں پڑا اناج بے ترتیبی سے ہڑپ کرنے والا بنا دے۔

بہاروں کا بیٹا

متن حکایت۔

قصہ ہے اک گلشن کا

جس میں آنا جانا تھا

بہاروں اور خزاؤں کا

بہاروں نے جب آنا ہوتا

خزاؤں کو تھا جانا ہوتا

خزاؤں کی جب باری ہوتی

بہاروں کی تیاری ہوتی

اک بار لیکن ایسا ہوا

الجھ پڑا خزاؤں سے

بیٹا ایک بہاروں کا

ایسے چلا ہے صدیوں لیکن

پر پکا دستور نہیں

ہم کو جانا منظور نہیں

یہ گلشن بس ہمارا ہے

اور سارے کا سارا ہے

شرح حکایت۔

اس حکایت میں بنیادی طور پر تین کردار ہیں، بہاروں کا بیٹا، گلشن اور بہار و خزاں۔ بیٹے سے ہماری مراد انسان کے اندر ترقی کرنے کی استعداد ہے اور گلشن سے مراد میدان عمل ہے۔ بہار و خزاں سے مراد انسان تمدن کا عروج و زوال ہے۔ انسان کی ترقی کرنے کی استعداد کو علامہ اقبال کے ان دو شعروں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

"تو شب آفریدی، چراغ آفریدم

سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کوہسار و زاغ آفریدی

خیابان و گلزار و باغ آفریدم"

تو نے رات بنائی میں نے چراغ بنایا۔ تو نے مٹی بنائی میں نے پیالہ بنایا۔ تو نے بیابان، کہسار اور جنگل پیدا کیے اور میں نے گلشن اور باغ بنائے یعنی انسان کے اندر اللہ تعالی کی دی ہوئی استعداد فطرت کو مزید ترقی کی طرف لے کر جاتی ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

"خواجہ چو بیلے بدست بندہ داد

خود بخود معلوم شُد اور مراد"

مالک نے جب کھدال اپنے ملازم کے ہاتھ میں دیا تو ملازم کو خود بخود پتہ چل گیا کہ یہ کھدال جو میرے ہاتھ میں دی گئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے محنت کرنی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہاتھ اور پاؤں دیے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں بذات خود اس چیز کا اعلان ہے کہ انسان کچھ کرنے کے لیے اس دنیا میں پیدا ہوا ہے۔

گلشن سے مراد انسانی شخصیت اور کائنات کی ہر شے کا وہ پہلو ہے جو مقصود اور مطلوب ہے۔ اور خزاں سے مراد انسانی شخصیت اور کائنات کی ہر شے کا وہ پہلو ہے جس سے انسان اپنی استعداد استعمال کرتے ہوئے نجات چاہتا ہے۔ مثلاً جسم کا گلشن ہے جس میں مقصود یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد استعمال کر کے جسمانی صحت کو مثبت سمت میں لے کر جائے۔اس طرح روح کا گلشن ہے جس میں انسان اپنی روحانیت کو اس طرح بڑھائے کہ مادیت کی خزاں کو اندر نہ آنے دے۔یعنی اپنی روح کو اس حد تک ترقی دے کہ جسم کے مرنے کے بعد اپنی روح کے ساتھ قائم ہو جائے۔

اسی طرح یہ سیارہ زمین ایک گلشن ہے جس میں ہماری ذمہ داری انوائرنمنٹ کی حفاظت ہے۔ جو چیزیں ماحولیات کے خلاف ہیں اُن کو روکیں جیسے پانی کا ضائع کرنا یا شجر کاری کو نہ بڑھانا—اسی طرح ہماری معاشرتی زندگی کا گلشن ہے—ہم اپنی معاشرتی زندگی کو اس طرح ترتیب دیں کہ ہم باقی لوگوں کے لیے فائدہ مند، آرام اور سکون کا باعث ہوں۔

انسان اپنی استعداد کو استعمال کرنے کے حوالے سے بے شمار امکانات رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے آس پاس موجود گلشنوں کو خزاؤں سے بچانے کے لیے بھرپور استعداد استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

متن حکایت۔

ایک نوجوان کا رنگ پیلا پڑ گیا تو اسے صحت کی فکر لاحق ہوئی۔ ایک سیانے نے اسے مشورہ دیا کہ سیب کھایا کرو۔ اس میں موجود وٹامنز تمہاری رنگت کو پھر سے سرخ کر دیں گے۔ نوجوان نے سیب کھانا شروع کیے لیکن اس کی رنگت میں کچھ فرق نہ آیا۔
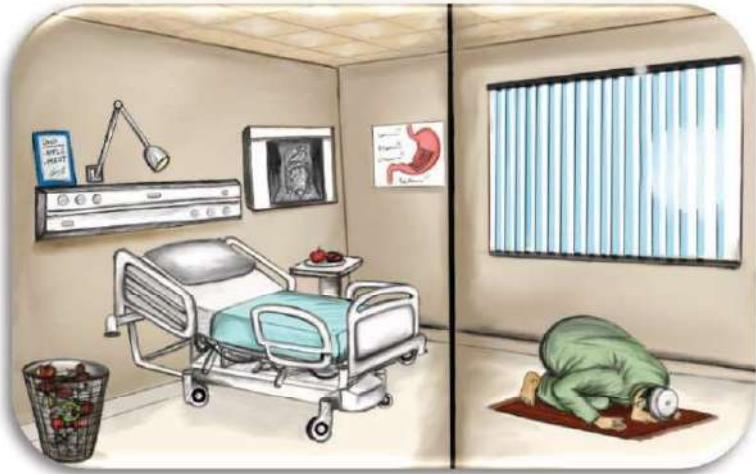
سیب کھانے سے اُلٹا اس کی طبیعت بھاری رہنے لگی۔

ایک بزرگ نے اسے بتایا کہ کلیجی کھایا کرو یہ تمھارے جسم میں خون بڑھائے گی۔ اس نے بزرگ کی بات مانتے ہوئے کلیجی کھانا شروع کر دی لیکن اس سے بھی اسے فائدہ نہ ہوا الٹا اس کا پیٹ خراب ہو گیا۔ جب کمزوری زیادہ ہو گئی تو اس کے کچھ دوست اسے ایک طبیب کے پاس لے گئے۔ طبیب نے بغور معائنے کے بعد اسے بتایا کہ تمہارا معدہ

صحیح کام نہیں کر رہا اور تمہیں معدے کے علاج کی اشد ضرورت ہے۔ معدے کی اصلاح کے بعد ہی کوئی غذا تمہیں تقویت پہنچائے گی۔

نوجوان نے معدے کا علاج کرایا اور اس کے بعد صحت مند غذائیں کھائیں، تھوڑے ہی عرصے میں وہ تندرست و توانا ہو گیا اور اس کے چہرے کی سرخی بھی لوٹ آئی۔

شرح حکایت۔

جس طرح ہر جسم کا ایک معدہ ہے اور وہ معدہ ٹھیک ہو تو وہ جسم جسمانی اعتبار سے صحت مند ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کا روحانی معدہ ٹھیک ہو تو وہ انسان اخلاقی اور روحانی طور پر صحت مند ہوتا ہے — ہم روح کے معدہ سے اور اُس کی خرابی سے کیا مراد لیتے ہیں۔۔ سب سے پہلے مولانا رومؒ کی مثنوی سے چند شعر پڑھتے ہیں۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

"ما دریں امبار گندم می کنیم
گندمے جمع آمدہ گم می کنیم"

"می بہ اندیشیم آخر ما بہ ہوش
کیں خلل در گندم است از مکر موش"

"موش تا امبار ما حفرہ زدہ ست
از فنش انبار ما ویران شدست "

"اول ای جان دفع شر موش کن
وانگہ اندر جمع گندم جوش کن"

فرماتے ہیں کہ ہم ایک بوری میں گندم جمع کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی اس جمع کی ہوئی گندم کو گم کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے بعد ہمیں یہ سمجھ آجاتی ہے کہ یہ گندم اس لیے کم

ہورہی کہ ایک چوہے نے ہمارے ساتھ مکر کیا ہوا ہے۔چونکہ چوہے نے ہماری اس گندم کی بوری میں نیچے سے سوراخ کیا ہوا ہے اس لیے اس چوہے کی کارستانی سے ہماری گندم کا ذخیرہ گم ہوتا رہتا ہے۔فرماتے ہیں،اے جان،پہلے تو اس چوہے کے شر کو ختم کر پھر اس کے بعد گندم جمع کرنے کے عمل میں سرگرمی دکھا۔

جس طرح اگر گندم کی بوری کے نیچے چوہوں نے سوراخ کیا ہو ،اوپر سے ہم گندم ڈالتے جائیں اور نیچے سے چوہے اس کو نکالتے رہیں تو وہ گندم کی بوری کبھی بھرے گی نہیں۔اسی طرح اگر انسان اخلاقی برائیوں کا شکار ہو تو اس کی عبادات اور مناجات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتیں کیونکہ وہ نیکیوں کو جمع کرتا ہے لیکن وہ نیکیاں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔

مولانا رومؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ :۔

"بشنواز اخبار آں صدر الصدور

لا صلوۃ تم الا بالحضور"

فرماتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سنو کہ حضوری قلب کے بغیر کوئی نماز مکمل نہیں ہوتی۔جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔لا صلوۃ تم الا بحضور القلب۔یعنی جب تک حضور قلب نہ ہو کوئی نماز مکمل نہیں ہوتی۔اصل میں انسان اپنی دماغی اور نفسیاتی صلاحیت سے عبادت اور اخلاقی کمزوری دونوں کو اکھٹا بھی کر سکتا ہے۔لیکن حضوری قلب ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو یہ دونوں کام اکٹھے نہیں کرنے دیتی۔حضوری قلب سے کیا مراد ہے۔یعنی جس بندے کا قلب اپنے رب کی حضوری میں ہو گا تو وہ گویا اپنے خدا کے ساتھ رابطے میں ہو گا۔اس حضوری میں یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے خدا کی

عبادت بھی کر رہا ہو اور اس کے متوازی اس کے دیے ہوئے اخلاقی نظام کو توڑ بھی رہا ہو۔

اکثر شعبہ ہائے زندگی سے منسلک لوگوں کو جب ہم ان کی عملی زندگی میں دیکھتے ہیں تو اگرچہ وہ عبادات بھی کرتے ہیں لیکن روزمرہ کے معاملات میں لوگوں کے ساتھ ان کا تعامل اور رویہ ان کی عبادات کی اصل غایت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ یوں ان کا اخلاقی معاملہ خلط ملط ہو جاتا ہے اور ان کی ارواح اپنے روحانی معدوں کے ضعف کی وجہ سے کمزور اور ضعیف ہی رہتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ہماری ارواح کے معدوں کو مضبوط بنانے کی توفیق عطاء فرمائے تا کہ ہماری ارواح صحت مند ہوں اور عبادات نتیجہ خیز ثابت ہوں، اور یوں ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو۔

سینگ اور سرمایہ

متن حکایت۔

ایک گائے کے سر پر دو نوکیلے سینگ تھے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے یہ سینگ کاہے کو سر پہ سجا رکھے ہیں۔ گائے نے کہا میرے سر میں سرمایہ ہے اور یہ سینگ اس سرمائے کی حفاظت کرتے ہیں۔

یہ سن کر پوچھنے والے نے کہا تیرا اصل سرمایہ تو دودھ ہے جو روزانہ تمہارے تھنوں سے نکال لیا جاتا ہے اور تو خاموش کھڑی رہتی ہے۔

شرح حکایت۔

گائے کو اس بات پر فخر ہے کہ اس کے سر پر سینگ ہیں اور سر کے اندر دماغ ہی اس کا اصل سرمایہ ہے۔ ایک آدمی اسے توجہ دلاتا ہے کہ تمھارے تھنوں سے ہر روز دودھ دھو لیا جاتا ہے جس کی تجھے فکر نہیں۔ بس سر پر سینگ سجا رکھے ہیں تا کہ سر کا سرمایہ

ضائع نہ ہو جائے۔ تمہارا اصل سرمایہ تو وہ دودھ ہے جو ڈھولیا جاتا ہے اور اسے بچانے کے لیے تم کچھ بھی نہیں کر پاتی۔

سر کے اندر سرمایے سے ہماری مراد آدمی کی انفرادی ذہنی استعداد اور آسمانی ہدایت سے کٹا ہوا جزوی تعقل ہے۔ ذہن یا تعقل کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن جب انسان اپنی ناقص عقل، ذہن اور دلیل پر ضد کرے اور اسے آسمانی حقائق کے مقابلے میں لا کھڑا کرے تو وہ ایک بری چیز بن جاتی ہے—اس کے مقابلے میں دودھ سے مراد حقائق کا خالص علم ہے جو وحی سے اور پھر دوسرے درجے میں وحی کی متابعت میں قلب کے راستے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہم جو قلب کے راستے کی بات کرتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی عقل ہے لیکن اس خالص عقل کی بنیاد فقط ظاہری حواس پر نہیں۔

ایک آدمی کی انفرادی عقل کائنات کی پوری حقیقت کے مقابلے میں ہمیشہ تھوڑی اور نا مکمل ہوتی ہے۔ ہم یہ چیز سائنسی طور پر بھی سمجھتے ہیں کہ ہماری اس زمینی دنیا کا پوری کائنات کے ساتھ کوئی موازنہ نہیں حتیٰ کہ اس سولر سسٹم کا بھی اس کائنات کے ساتھ جس میں اربوں ستارے ہیں کوئی موازنہ نہیں۔ ایسے ہی انسان کا ذہن اور اس کی انا کا حصار اس کائنات کے مقابلے میں حد درجہ چھوٹے اور حقیر ہیں۔

سینگ پہ فخر کرنا در اصل اپنی عقلی استعداد پر حد درجہ اسرار کرنا ہے۔ یہ اسرار آہستہ آہستہ قلب کی طرف جانے والے رستے بلاک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے ایک آدمی کو موٹاپا ہو تو اس کے اندر انسولین سے مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی اس کا لبلبہ تو انسولین بنا رہا ہے لیکن چربی کی وجہ اس کے باڈی سیلز انسولین کو جذب نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی انسان کا قلب اس کو بدستور سگنل دے رہا ہوتا ہے لیکن ایک کم درجے کا تعقل، انا کی تنگی اور جبلتوں کا غلبہ مزاحمت پیدا کرتا ہے جس سے وہ آدمی قلب کے سگنل

وصول نہیں کر سکتا۔ اگر لبلبہ بدستور انسولین بناتا رہے اور سیلز چربی کی وجہ سے انسولین مزاحمت پہ برقرار رہیں تو پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ انسولین بناتے بناتے پنکریاز کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بعینہ جب ایک انسان کو اس کا قلب سگنل دیتا رہے اور وہ اس سے مسلسل غافل رہے تو پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ قلب سگنل دینا بند کر دیتا ہے۔

سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (سورۃ بقرہ آیت نمبر 7)

کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ یعنی وہ لوگ کافی عرصے تک ناپسندیدہ اعمال میں رہے۔ ان کا ضمیر ان کو ملامت کرتا رہا۔ لیکن وہ ضمیر کی آواز کو مسلسل نظر انداز کرتے رہے اور بالآخر یوں ہوا کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے قلوب کو زندہ کرے اور ہمیں وحی کی متابعت میں قلوب کی جہت سے حقائق کا وہ علم عطاء کرے جس سے ہماری ارواح بلندی کی طرف بڑھنا شروع کر دیں۔

کیکر کا بیٹا

متن حکایت۔

جنگل میں کیکر کا ایک درخت بڑی شان سے کھڑا تھا۔ ہر طرح کی گرمی سردی برداشت کرتا لیکن اس کی استقامت میں کوئی فرق نہ آتا۔ ایک دن کیکر کے بیٹے نے اپنے باپ سے کہا؛ ہم کتنا عرصہ پاؤں زمین میں دبائے یوں ہی کھڑے رہیں گے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ دوسرے جانداروں کی طرح چلیں پھریں۔

کیکر نے بیٹے کو جوب دیا؛ زمین اور آسمان ہمیں ہمارا رزق مسلسل پہنچاتے رہتے ہیں۔ ہمیں رزق کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنا نہیں پڑتا اور پھر دیکھو یہ انسان، یہ مویشی خود چل کر ہمارے پاس آتے ہیں، پرندے ہمارے اوپر گھونسلے بناتے ہیں، ہواؤں کی ڈیوٹی ہے کہ ہمارے پاس آکر جھولیں، بادلوں کو حکم ہے کہ ہمارے اوپر برسیں۔ یہ سب ہماری استقامت کی وجہ سے ہے اور یہ استقامت ہمیں بہت عزیز ہے۔

شرح حکایت۔

استقامت سے مراد انسان کی شخصیت کے ہر وصف کے اندر استقامت کی موجودگی ہے۔یعنی وہ شخصیت کے ہر وصف کے اندر کیسے استقامت دکھاتا ہے۔کیکر کا بیٹا خواہش کرتا ہے کہ ہم بھی باقی جانداروں کی طرح گھومیں پھریں۔ہم کیوں جنگل میں ایک ہی جگہ کھڑے ہیں۔تو باپ اسے کہتا ہے کہ دیکھو ہمیں زمین و آسمان سے بدستور رزق مل رہا ہے اور ہماری بڑھوتری بھی ہو رہی ہے؛ بارشیں ہمارے اوپر برستی ہیں زمین ہمیں خوراک مہیا کرتی ہے۔ سورج ہمارے اوپر چمکتا ہے جانور ہمارے پاس آکر ہمارے سایے میں ٹھہرتے ہیں ۔ پرندے گھونسلے بناتے ہیں ۔یعنی جب ہمارے پاس تمام سہولتیں ہیں تو پھر ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم کسی نئ مہم پہ نکل پڑیں۔

یہاں یہ چیزیں نوٹ کرنے والی ہے کہ درخت عمودی بڑھوتری میں ہوتا ہے اس کی جڑیں زمین میں گہری ہو رہی ہوتی ہیں اور وہ اوپر کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی انسان عمودی طور پر ترقی کر رہا ہے،یعنی زندگی کے اعلی مقاصد کی طرف بڑھ رہا ہے تو اس صورت میں اگر وہ افقی بڑھوتری میں زیادہ آگے نہ بھی ہو۔ مناسب گذر بسر ہو رہی ہوں تو یہ معاملہ اس کے لیے کافی ہوتا ہے۔

انسان کو چاہیۓ کہ وہ دنیاوی اعتبار سے اپنی صورت حال کا محاسبہ کرے،کیا واقعی اس کو مادی لحاظ سے مزید پھیلنے یا منتشر ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ زندگی مختصر ہے،ہو سکتا ہے کہ غیر ضروری پھیلاؤ انسان کو غیر ضروری چیزوں میں الجھا دے جو آخر کار اس کے لیے نقصان کا باعث ہوں۔اصل میں انسان کی ضروریات محدود ہیں یعنی کائنات کا نظام اور دنیا کے ذرائع تو لا محدود ہیں لیکن ایک آدمی کی انفرادی ضرورت محدود ہے۔

مولانا روم ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"گر بریزی بحر را در کوزہ
چند گنجد قسمت یک روزہ"

اگر تم سمندر کو کوزے میں ڈالو گے تو کوزے میں کتنا پانی آئیگا، اُتنا ہی آئے گا جتنا ایک دن کے استعمال کے لیے ہے۔ یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے ؛ انسان جو وسائل اکٹھے کرتا ہے ان میں جو اس کی ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں وہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ صرف وہی اس کے کام آتے ہیں جو اس کے استعمال کے پیٹ کے لوٹے میں آتے ہیں۔ انسان کو اپنے افقی یعنی مادی پھیلاؤ کی حد مقرر کرنی چاہیے اور اپنی استعداد کو اپنی عمودی یعنی اپنی روحانی ترقی کی طرف موڑنا چاہیے۔

بنی اسرائیل جب ایک وسیع میدان میں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہاں انہیں من و سلوی مل رہا تھا تو انہوں نے مزید چیزوں کی خواہش کی۔ قرآن پاک میں ہے کہ۔

"وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَنْ نَصْبِرَ عَلَى طَعَامٍ وَاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الأَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا"

(سورۃ بقرہ آیت 41)

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم کسی ایک خوراک پہ صبر نہیں کریں گے آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے زمین میں اُگنے والی چیزیں جیسے ساگ، ککڑی، گندم، دال اور پیاز یہ چیزیں ہمارے لیے زمین سے اگائے ؛

تو اللہ تعالی نے فرمایا۔

أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هو *أَدْنى بِالَّذِي* هو *خَيْرٌ* (سورۃ البقرۃ آیت نمبر 41)

کیا تم ایک اچھی چیز کو ایک حقیر چیز کے ساتھ بدلنا چاہتے ہو۔

اچھا تم کسی شہر میں نکل جاؤ؛ وہاں یہ جو تم خواہش کر رہے ہو تمہیں مل جائیگی۔

اور پھر آخر میں فرمایا۔

وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ(سورۃ بقرہ آیت نمبر 41)

وہ پھر اللہ کے غضب کا شکار ہو گئے۔

یعنی اُنہوں نے جو آسان معاملہ تھا جس سے اُن کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں اس کے بدلے میں خواہش کی کہ ہمیں اور چیزیں چاہئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم اس طرح کرو کہ اس میدان سے نکل کر کسی شہر میں داخل ہو جاؤ۔ یعنی تم شہر میں جا کر شہری سر گرمیوں میں داخل ہو جاؤ۔ شہر میں داخل ہونے سے مراد غیر ضروری سر گرمیوں کا شکار ہونا ہے۔ وہاں تم وہ دال، پیاز تو حاصل کر لو گے لیکن تمہاری زندگی مشکل چیزوں میں کھو کر رہ جائیگی۔ تو پھر کیا ہوا کہ وہ اللہ کے غضب کا شکار ہو گئے۔

انسان کی انفرادی زندگی ایک محدود ٹائم کے لیے ہے اور اس کے سامنے وسیع دنیا ہے۔ بیشتر امکانات ہیں۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی صورت حال کو پرکھے کہ اُس کو یہ زندگی گزارنے کے لیے کونسی چیز کتنی مقدار میں چاہیے پھر اس میں استقامت دکھائے۔ علم کے معاملے میں دیکھے کہ خالص علم کیا ہے جو اس کو اخروی زندگی کے لحاظ سے فائدہ دیتا ہے۔ اسی طرح کتنے مادی ذرائع اس کی علمی اور روحانی زندگی کی سپورٹ کے لیے کافی ہیں۔ دنیا میں بے شمار چمک اور رنگینی ہے۔ اگر انسان ہر چیز کے پیچھے دوڑے تو پھر اُن چیزوں میں ہی پھنس کے رہ جاتا ہے۔

مولانا روم ایک جگہ فرماتے ہیں کہ۔

"من کہ باشم چرخ باصد کاروبار"

میں کیا چیز ہوں آسمان کو تو سینکڑوں کام ہیں۔

یعنی کائنات تو بہت وسیع ہے اگر ہم اپنے آپ کو ایک خاص پیٹرن میں ڈال کر ایک متوازن طریقے سے قائم نہیں کرتے تو پھر ہمارا وقت ضائع ہونے کا امکان ہے۔

درزی اور سلائی مشین

متن حکایت۔

ایک درزی صبح سویرے اپنی دکان کھولتا اور شام تک کپڑے سیتا رہتا۔ صبح سے شام مشین چلا کر وہ مشکل سے ایک جوڑا کپڑے ہی تیار کر پاتا۔ پھر اس نے سلائی مشین پر برقی موٹر لگالی جس سے اس کے کام میں تیزی آ گئی۔ اب وہ روزانہ دو جوڑے کپڑے سی لیتا تھا۔

اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس سے بھی زیادہ کپڑے سیے لیکن اس کی استطاعت میں مزید اضافہ نہ ہو سکا۔

اصل میں اس کی دکان میں لگے گھڑیال کی حرکت، سلائی مشین کی رفتار اور اس کی مہارت اس سے بہتر نتیجہ پیدا ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کو بہر حال اسی پہ اکتفا کرنا تھا۔

شرح حکایت۔

ایک درزی اپنی دکان میں سارے دن میں ایک عام سلائی مشین کے ساتھ ایک ہی سوٹ سلائی کرتا تھا— لیکن جب اس نے ٹیکنالوجی کا استعمال کیا اور مینول سلائی مشین کو برقی موٹر لگالی تو اس کی استعداد میں اضافہ ہو گیا اور وہ اُسی خاص وقت میں جو اُس کی دکان کی دیوار پر لگا ہوا گھڑیال دکھاتا تھا ایک کی بجائے دو سوٹ سینے لگا۔

یعنی اس کی پیداوار میں سو فیصد اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد وہ اپنی موجودہ انفرادی استعداد ، ٹیکنالوجی کے استعمال اور دستیاب وقت کے استعمال سے مزید اوپر نہیں لے جاسکتا تھا۔ اس کو اتنی ترقی پر ہی اکتفا کرنا تھا— یہ ایک معقول صورت حال ہے کہ بندہ ترقی کے مراحل سے گزرے اور اپنی استعداد کو علم اور ٹیکنالوجی کی مدد سے بڑھائے۔ یہاں تک درزی کا طرز عمل ایک مناسب بات ہے۔

لیکن درزی کی یہ حالت دراصل معروضی حالات کا ایک جبر ہے کہ وہ یہاں پر فکس ہو گیا ہے اور اس سے آگے نہیں جا سکتا— حالات کا جبر ایک حقیقت ہے لیکن یہ کوئی مطلق حقیقت نہیں ؛ بلکہ ایک خاص حالت اور ایک خاص وقت میں کسی آدمی کی موجودہ استعداد کا تعین ہے۔

اصل میں جسمانی، مادی اور روحانی اعتبار سے انسان کی صلاحیت اور قابلیت اس کی موجودہ معروضی حیثیت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگرچہ انسانی اقوام کی ترقی کو مختلف ادوار میں مختلف قسم کے حالاتی جبر روکتے ہیں لیکن انسان کی ترقی اور آگے بڑھنے کی استعداد کو مستقل طور پر روکا نہیں جاسکتا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ(سورۃ الجاثیہ آیت 13)

ہم نے تمہارے لیے آسمان اور زمین مسخر کر دیا ہے۔"جمیعا منہ "اس کے اندر جو کچھ ہے وہ تمام تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ اسمیں تفکر کرنے والوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کی استعداد اور ترقی پر کوئی قدغن نہیں لگائی بلکہ فرمایا کہ زمین اور آسمان کے اندر جو کچھ بھی ہے تمہارے تابع کر دیا ہے، تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔

آدم علیہ السلام کے واقع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ۔

وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّہَا(سورۃ بقرہ آیت 31)

ہم نے آدم کو تمام اسماء سکھا دیے۔

ان آیات کی روشنی میں دیکھیں تو وہ درزی جس کی استعداد ٹیکنالوجی کے استعمال کے باوجود ایک جگہ پر آ کر رک گئی ہے اور وہ اس گھڑیال کے ٹائم کے اندر قید ہے؛ یہ صرف ایک خاص وقت میں ایک خاص آدمی کی صلاحیت ہے -یہ کوئی مطلق حقیقت نہیں ہے-یعنی اُس کا وہ دن جس میں وہ آٹھ، دس، بارہ گھنٹے کام کرتا ہے، وہ دن جس شمس کے طلوع اور غروب ہونے سے منسلک ہے، وہ شمس بھی انسان کے لیے تسخیر کر دیا گیا ہے—انسان کی یہ زندگی اس کا کل سفر نہیں ہے اور نہ ہی یہ موجودہ زندگی کی موت اسے مار سکتی ہے۔ وہ اگلے جہانوں کا مسافر ہے اور جبر اور اختیار کا یہ سفر جاری ہے۔

سورۃ یوسف میں یوسف علیہ السلام جب اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو اپنا خواب سناتے ہیں تو فرماتے ہیں۔ قرآن پاک میں آتا ہے۔

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد صاحب سے کہا اے والد محترم میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کررہے ہیں۔ لوگ ستاروں کے اثرات کو اپنی زندگی پر محسوس کرتے ہیں اور اس بارے میں پریشان ہوتے ہیں جبکہ یوسف علیہ السلام جو انسانیت کی معراج پر ہیں وہی سورج، چاند اور تارے اُن کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی حقیقت ہے۔ اس کے بر عکس وہ حالت جس میں انسان ستاروں کے اثرات سے گھبرا رہا ہوتا ہے وہ ایک عارضی جبر ہے جو کہ حقیقی نہیں ہے۔ انسان جب مادی اور روحانی ترقی کر کے آگے بڑھتا ہے تو بے شمار غیر حقیقی اور عارضی حالات پر غالب آجاتا ہے۔

متن حکایت۔

راموکے پاس ایک اچھی نسل کا گھوڑاتھاجواس نے تانگے کے ساتھ جوت رکھا تھا۔یوں یہ اس کے لیے روزی کاایک ذریعہ تھا۔

ایک دن رامو نے اپنے گھوڑے کو بتایا کہ ولایت میں گھوڑوں کی ایک دوڑ ہوتی ہے جسے ڈربی کہتے ہیں،اس دوڑ میں کئی اعلی قسم کے گھوڑے حصہ لیتے ہیں۔رامو کی بات سن کر گھوڑے نے کان کھڑے کر لیے۔

پھر رامو نے بتایا کہ ڈربی جیتنے والے گھوڑے کو کروڑوں روپے کا انعام ملتا ہے۔ گھوڑے نے یہ سناتوپہلے توخاموش ہوگیا،پھر وہ اچانک راموسے مخاطب ہوااور کہا۔ہم گھوڑوں کونہ توپیسوں کااستعمال آتاہےاورنہ ہی پیسوں کی کوئی اورضرورت ہوتی ہے، پھریہ کروڑوں کاانعام کس کام کا۔

رامو نے کہا، پگلے یہ پیسے اگرچہ گھوڑا جیتتا ہے لیکن ملتے یہ گھوڑے کے مالک کو ہی ہیں
۔

شرح حکایت۔

رامو نے جب گھوڑے کو بتایا کہ ریس میں حصہ لے کر گھوڑا ایک بڑی رقم جیت جائے گا تو گھوڑے نے اسے بتایا کہ اس کے لیے تو یہ رقم کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ گھوڑوں کا ان پیسوں سے کچھ کام نہیں ہوتا۔اس حکایت کا سبق یہ ہے کہ محنت کرنے والا کو اس کی محنت کا ثمر اس طرح ملنا چاہیے کہ وہ اس محنت کرنے والے کو فائدہ دے یعنی محنت کا ثمر محنت کرنے والے کی جنس کے لیے فائدہ مند ہونا چاہیئے۔ ورنہ سب بے کار مشق ہے۔

انسان جسم اور روح سے مرکب ہے۔اس کی جسم اور مادے کی محنت اکثر صورتوں میں صرف جسمانی اور مادی فائدہ دیتی ہے۔ اگر انسان مسلسل جسمانی یا مادی کوشش کرتا رہے تو اس سے اس کو جو ثمر حاصل ہو گا بسا اوقات وہ اس کی روح کے ساتھ متجانس نہیں ہو گا۔اس کی روح کو اس مادی جدو جہد کا فائدہ نہیں ہو گا۔

مثنوی شریف میں مولانا روم مجنوں کا ایک واقع بیان کرتے ہیں۔ مجنوں اونٹنی پہ بیٹھ کر لیلٰی کے گاؤں کی طرف جا رہا ہے جبکہ اُونٹنی کا چھوٹا بچہ گاؤں میں ہے۔جب مجنوں نے اُونٹنی کی مہار کو مضبوطی سے پکڑا ہوتا ہے اور وہ ہشیار ہوتا ہے تو وہ اونٹنی اس کے بتائے ہوئے رستے پر چلتی ہے لیکن جو نہی مجنوں غافل ہوتا ہے تو چونکہ اس اُونٹنی کو اپنا بچہ یاد آتا ہے تو وہ پیچھے گاؤں کی طرف چلنا شروع کر دیتی ہے—جب اچانک مجنوں کو ہوش آتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ میں نے جتنی منزلیں آگے کی طرف طے کی تھی یہ اونٹنی مجھے پھر

سے پیچھے کی طرف لے آئی ہے۔ وہ اس کو سیدھا کر کے پھر آگے کی طرف موڑتا ہے اور یہ کشمکش اسی طرح جاری رہتی ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ۔

"در سہ روزہ رہ بدیں احوال ہا

ماند مجنون در تردد سال ہا"

یہ جو تین دنوں کا راستہ تھا۔ اس طرح کے حالات میں جس میں اونٹنی کی کشش پیچھے کی طرف (جسم اور مادے کی طرف) تھی اور مجنوں کی کشش آگے کی طرف (روح اور عشق حقیقی کی طرف) تھی کئی سالوں میں بھی طے نہیں ہوا۔ یہاں اونٹنی کی محنت مجنوں کی محنت سے مختلف جنس کی تھی اس لیے مجنوں کو فائدے کی بجائے نقصان دے رہی تھی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح کی محنت کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس سے حاصل ہونے والا ثمر ہماری روحانی قدر اور منزلت میں اضافہ کرے تاکہ ہم نہ صرف اس زندگی میں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں بھی کامیاب ہو جائیں۔

بولنے والی کار

متن حکایت۔

ایک کار فراٹے بھرتی ہوئی لاہور پہنچی۔ لاہور پہنچتے ہی فرنٹ سیٹ بولی، واہ میں کتنی سہولت سے لاہور پہنچ گئی، بالکل فریش۔ ڈیش بورڈ بھی اسی طرح اترایا کہ وہ پوری چمک دمک میں ہے اور اسکے چہرے پر سفر کی کوئی تھکان نہیں ہے۔

پھر ان دونوں نے مل کر ٹائروں کی خوب غیبت کی کہ کیا ہی گندی مخلوق ہے، پتہ نہیں کس کس گند میں پاؤں مار کر لاہور پہنچے ہوں گے۔
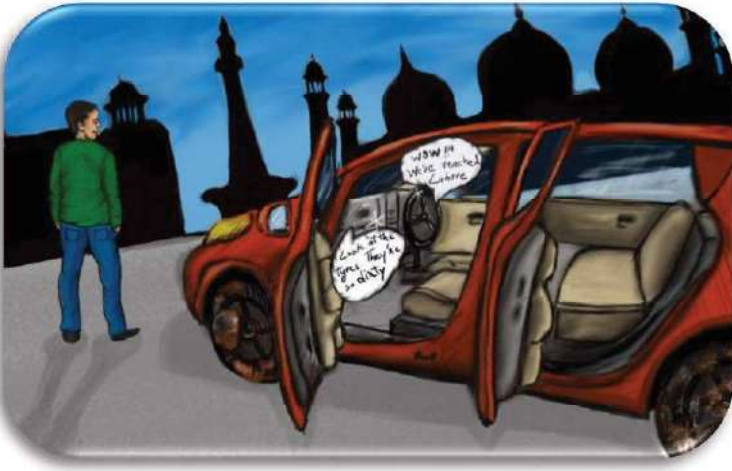
ٹائروں نے یہ سنا تو بولے بلاشبہ ہم طرح طرح کے حالات سے گزر کر لاہور پہنچے ہیں اور ہماری جان غلاظت سے اٹی ہوئی ہے، لیکن اگر ہم یہ سب کچھ نہ جھلیتے تو تم لوگ یوں صاف شفاف لاہور کیسے پہنچ جاتے۔

ان سب کی یہ گفتگو سن کر کار کا ڈرائیور جس کے ہاتھ میں چابی تھی کافی دیر تک مسکراتا رہا۔

شرح حکایت۔

کار کی فرنٹ سیٹیں اور ڈیش بورڈ جو کہ صاف اور چمک دار ہیں ٹائروں کا تمسخر اُڑاتے ہیں کہ یہ تو گندے مندے ہیں اور ہم بہت صاف ستھرے ہیں۔ اور اس حکایت میں ہم یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ کار تو ٹائروں کے بغیر چل ہی نہیں سکتی اس لیے کہ اس کار کے مختلف پارٹس کے درمیان مرتبوں کا فرق دراصل کار بنانے والے کی سکیم ہے۔ اس سکیم کے بغیر کار کے وجود اور حرکت کا کوئی تصور ہی نہیں۔

ہمارا معاشرہ بھی ایک کار کی طرح ہے اس میں مقتدر اور خوشحال طبقہ گاڑی کی سیٹوں اور ڈیش بورڈ کی طرح چمک دمک رکھتا ہے۔ جبکہ غریب اور پسماندہ طبقہ ٹائروں کی طرح دھول مٹی سے اٹا رہتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خوشحال طبقہ غریب اور پسماندہ طبقے کا مزاق اُڑاتا ہے۔ یہ تمسخر بعض اوقات ظاہری ہوتا ہے اور بعض اوقات معنوی۔ معنوی تمسخر کیا ہے۔ معنوی تمسخر سے مراد یہ ہے کہ مقتدر، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوشحال لوگ غریب اور پسماندہ طبقے کو مختلف حیلوں، چالاکیوں اور قانون سازی سے اپنے سے الگ مرتبے پر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر چہ ایسی قانون سازیوں سے یہ معاملہ ان کے نزدیک ان کے لیے جائز ہو جاتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے کہ ایسی قانون سازی آسمانی تعلیمات کے اصولوں پر پورا بھی اترے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ (سورۃ آل عمران۔140)

یعنی یہ دن ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں یعنی دنیا میں جو حالات لوگوں کو پیش آتے ہیں یہ محض ایام کا تدول ہے۔ آج یہ ایام ایسے ہیں کل دوسری طرح سے ہیں ۔کیونکہ انسان بنیادی طور اس دنیا میں آزمائش میں ہے۔ اس زندگی میں وہ کیا اعمال کرتا

ہے۔وہ زندگی کیسے گزارتا ہے اس کی بنیاد پر اگلی زندگی میں اس کو فائدہ ہو گا۔یہ جو ایام کا تداول ہے اور مختلف لوگ مختلف حالات میں ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی سکیم کے ساتھ ہے امیر ہونا یا غریب ہونا اور خوشحال ہونا یا پسماندہ ہونا یہ دنیا کی ظاہری حالت ہے۔اچھا انسان کون ہے۔نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔

" خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَّنْفَعُ النَّاس"

لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

یعنی یہ جو ظاہری حالات ہیں اس میں امتحان یہ ہے کہ کون دوسرے کے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔ہمیں چاہیے کہ ہم ظاہری حالت کی بناء پر لوگوں کی حقیقت پر قیاس نہ کریں، بلکہ یہ بات ملحوظ خاطر رکھیں کہ ہم صرف اسی صورت میں بہتر انسان ہیں اگر ہم دوسروں کے لیے فائدہ مند ہیں۔

متن حکایت۔

پہاڑوں کے درمیان ایک ندی شمال سے جنوب کی طرف بہہ رہی تھی۔ ندی کا پاٹ خاصا چوڑا تھا۔ پانی کی رفتار تیز تھی اور ندی کے بہنے کا شور پوری وادی میں سنائی دیتا تھا۔

روزانہ کئی درخت پہاڑوں کے اطراف سے ٹوٹ کر اس ندی میں گرتے اور پانی میں شمال سے جنوب کے رخ بہہ جاتے۔ تاہم ایک درخت ندی کے اس پار کنارے پر مضبوطی سے کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہم نفسوں کو شمالاً جنوباً بہتے دیکھتا لیکن خود اس ندی کی گرفت سے قطعی آزاد تھا۔

شرح حکایت۔

ایک ندی میں پہاڑ سے درخت ٹوٹ کر گرتے ہیں اور وہ شمال سے جنوب بہہ نکلتے ہیں لیکن ایک ایسا درخت ہے جو ندی کے کنارے کھڑا ہے۔وہ آزاد اور خود مختار ہے اور پانی کا بہاؤ اس پر کچھ اثر نہیں کرتا۔

ہم میں سے اکثر لوگ زمان و مکان کی گرفت میں ہیں جبکہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہیں۔ اس حکایت کی شرح بہت دقیق ہے اور یہ موضوع بھی بہت دقیق ہے لیکن جو لوگ حقائق کے علم کے حصول کی کوشش کرتے ہیں انہیں اپنی زندگی میں اس چیز کی کچھ نہ کچھ سمجھ ضرور آجاتی ہے۔

اصحاب کہف وہ لوگ تھے جو ایک غار میں تین سو نو (309) سال تک رہے۔ وہ زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہو گئے تھے۔ عام آدمی تو ندی کے درختوں کی طرح شمال سے جنوب بہہ جاتا ہے کیونکہ وہ زمان و مکان کی گرفت میں ہوتا ہے۔ سورج طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ دن، مہینوں اور سالوں میں بڑھتے جاتے ہیں۔ ایک وقت پر انسان کی عمر ختم ہو جاتی ہے اور وہ دنیا سے چلا جاتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے عظیم لوگ موجود ہیں جو اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی روحانی حقیقت کو زمان و مکان کی گرفت سے آزاد کر لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اصحاب کھف کے بارے میں قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

" وتَرَى الشَّمْسَ إذا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذاتَ اليَمِينِ وإذا غَرَبَتْ تَقْرِضُهم ذاتَ الشِّمالِ و هم في فَجْوَةٍ مِنهُ"

کہ تو سورج کو دیکھے کہ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو ان کی داہنی طرف سے گزر جاتا ہے اور جب غروب ہوتا ہے تو ان کی باہنی طرف سے کترا کر گزر جاتا ہے اور وہ اس سورج سے بچ کر غار کے وسیع احاطے میں ہیں۔

یعنی وہ سورج طلوع ہونے کے اعتبار سے اور غروب ہونے کے اعتبار سے ان اصحاب کہف پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ سورج کا طلوع اور غروب ہونا اور وقت کا دن مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہونا اصحاب کہف پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

مولانا روم اپنے مثنوی میں ان اصحاب کہف کے ذکر فرماتے ہیں۔

"کاش چو اصحاب کہف این روح را

حفظ کردی یا چوں کشتی نوح را"

کہتے ہیں کاش تو نے اصحاب کہف کی طرح اس روح کو حفظ کر لیا ہوتا, محفوظ کر لیا ہوتا یا پھر جس طرح کشتی نے نوح کو محفوظ کر لیا تھا۔

"وارہیدی این ضمیر و چشم و گوش

تا ازیں طوفان بیداری و ہوش"

تا کہ تو اس بیداری اور ہوش کے طوفان سے اپنی آنکھوں، کانوں اور ضمیر کو رہا کر لیتا۔

فرماتے ہیں۔

"اے بسا اصحاب کہف اندر جہاں

پہلوئے تو پیش تو ہست ایں زمان"

فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں بے شمار اصحاب کہف ہیں جو اس وقت بھی تیرے پہلو میں، تیرے آگے پیچھے موجود ہیں۔یعنی ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو زمان و مکان کی گرفت سے آزاد کر لیا ہے۔اللہ تعالی ہمیں اپنی شخصیت کی جہت لطیف یعنی روحانی جہت کو مستحکم کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہم زمان و مکان کی گرفت سے آزاد ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کی کامیاب زندگی میں داخل ہو سکیں۔

موبائل فون

متن حکایت۔

ایک لڑکا جب ہاسٹل میں رہنے کے لئے گیا تو اس کے والدین نے اسے ایک آئی فون اور کنکشن سم لے کر دی۔ اس کیلئے کچھ جیب خرچ بھی مقرر کیا تا کہ وہ کھانے پینے کے علاوہ اپنے فون میں کچھ بیلنس بھی رکھ سکے اور اس طرح اپنے والدین سے رابطہ استوار رکھے۔

وہ فون اور بیلنس کا بے کار استعمال کرتا اور کم ہی کبھی اس نے اپنے والدین سے رابطہ کیا۔ اکثر اس کے پاس والدین کو کال کرنے کے لیے بیلنس بھی باقی نہ ہوتا۔

ایک رات اچانک اس کے سینے میں سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے چاہا کہ وہ اپنے والدین سے رابطہ کر کے انہیں اپنی تکلیف کے بارے میں بتائے، لیکن بیلنس نہ ہونے کی وجہ سے اسے کال کرنے کی سہولت دستیاب نہیں تھی۔

وہ شدید تکلیف میں تھا، کمرے میں تنہائی تھی، باہر سخت اندھیرا تھا اور بازار بھی بند ہو چکا تھا، وہ بے بس ہو گیا اور اسی بے بسی میں اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔

شرح حکایت۔

ایک لڑکا کالج کے ہوسٹل میں رہنے کے لیے جاتا ہے۔ اس کے والدین اسے موبائل فون لے کر دیتے ہیں تا کہ وہ ان سے رابطے میں رہے۔ اس حکایت میں دنیا کی زندگی کو کالج کے ہاسٹل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر کالج میں طالب علم تعلیم حاصل کرنے جاتا ہے تا کہ وہ اپنی حالت کو آئندہ آنے والی زندگی میں ترقی دے سکے۔ انسان بھی دنیا میں اسی لیے آتا ہے کہ دنیا میں سمجھے، سیکھے اور اپنی روحانی استعداد کو بلند کرے۔

لڑکے کو اس کے گھر والے آئی فون لے کر دیتے ہیں ۔آئی فون سے مراد I AMNESS یعنی انسان کا اپنی ذات کا شعور ہے۔ اس شعوری ذات کا استحکام انسان کی زندگی کا بنیادی مقصد ہے۔ ایک انسان نے زندگی میں کے کئی کردار ادا کرنے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کرداروں میں کھو کر انسان اپنے ذاتی شعور کو بھلا دیتا ہے۔ اور فون کے اندر جو سم ہے اس سے مراد انسان کی اپنے خدا سے رابطہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

جیسے ایک فون سم کے ساتھ ہم پورے نیٹ ورک سے کنیکٹ ہو جاتے ہیں ایسے ہی انسان اپنے قلب کے ساتھ کائنات اور خدا کے ساتھ رابطہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سم کے اندر بیلنس موجود ہونے سے مراد انسان کے اندر موجود قلبی صلاحیت کا تزکیہ اور ترقی ہے تا کہ اس کی استعداد ایک اچھی حالت میں باقی رہے اور وہ کائنات سے اور اپنے خدا سے رابطے میں رہے۔ جس طرح لڑکا اپنی سم میں بیلنس نہ ہونے کی وجہ

سے ضرورت پڑنے پر اپنے والدین سے رابطہ نہ کر سکا ایسے ہی ایک آدمی اپنی ضعیف قلبی استعداد کی وجہ سے اپنے خدا سے تعلق استوار کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے—

سورۃ حشر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ"

تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو بُھلا دیا تو پھر اللہ نے اُن سے ان کا اپنا آپ بھلا دیا۔

ایک اور جگہ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

" لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا"

ان کے پاس قلوب ہیں (دل ہیں)، لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔

مولانا روم فرماتے ہیں۔

"جان نہ باشد جز خبر در آزموں

ہر کرا افزوں خبر جانش فزوں"

روح خبر کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے اور جس کے پاس خبر زیادہ ہے اس کے پاس روح بھی زیادہ ہے۔ یعنی وہ روح جو اپنی، کائنات کی اور خدا کی زیادہ خبر رکھتی ہے ایسی روح کامیاب روح ہے۔

مولاناؒ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

"اے برادر تو ہمی اندیشہ ای

باقی تو استخواں وریشہ ای"

اے بھائی تو بس تفکر کا نام ہے۔ یعنی اپنے آپ، اس کائنات اور خدا کے بارے میں آگاہی حاصل کرنا ہی تیرا اصل کام ہے۔ تیری باقی شخصیت تو بس ہڈیاں اور گوشت

ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے ذاتی شعور کو مستحکم کرنے کی توفیق عطافرمائے تاکہ ہم آنے
والی زندگی میں کامیاب ہو سکیں مبادا کہ کہ مرنے کے بعد اس عظیم کائنات میں اپنی
پہچان ہی کھو بیٹھیں۔

خودساختہ دنیا

متن حکایت۔

کسی جدید شہر میں واقع ایک نئی ہاؤسنگ سکیم میں چند خالی پلاٹوں میں زیرِ زمین چوہوں کی بستی تھی۔ زمین کے نیچے ہی نیچے انہوں نے کئی بلیں بنا رکھی تھیں۔ یہی ان چوہوں کی تمام دنیا تھی۔ اسی میں بسیرا کرتے اور اسی میں سے مٹی اور کیڑے مکوڑے کھا کر گزارا کرتے۔

ایک بڑے چوہے نے نوجوان چوہوں کو اس بات کا یقین دلا رکھا تھا کہ یہ ہماری زیر زمین چوہی دنیا ہی اصل دنیا ہے اور اس سے بڑھ کر تمنا اور جستجو کرنا عبث ہے۔ اس بڑے چوہے نے نوجوان چوہوں کو یہ بھی بتا رکھا تھا کہ ہم چوہوں کو ہمیشہ افقی حرکت ہی کرنی ہے۔ کوئی بھی ایسی حرکت جو عمودی سمت میں ہو وہ ہمارے لیے خطرناک ہو گی۔ یوں وہ سب چوہے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔

پھر اچانک ایک کنسٹرکشن کمپنی نے ان خالی پلاٹوں کی کھدائی کا کام شروع کر دیا۔ جوں ہی ایکسکیویٹر کا پہلا پھاوڑا زمین پر پڑا، زیرِ زمین چوہی دنیا میں قیامت برپا ہو گئی۔ جُوں جوں کھدائی ہو رہی تھی چوہوں کی زیرِ زمین دنیا تباہ ہو رہی تھی۔ بے بس چوہے اپنے داناؤں کی طرف دوڑے لیکن وہ تو خود بھی گھبرائے ہوئے اور حوصلہ ہارے ہوئے تھے۔ ایسے میں چوہے اپنی بلوں سے نکل کر اوپر کی طرف بھاگے اور دوڑتے دوڑتے سڑک پر آ گئے۔

یہ کیا! وہ اس بیرونی دنیا کی روشنیاں اور وسعتیں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ یہ سڑکیں، یہ بنگلے، یہ آب و ہوا اور دلکشی، زیرِ زمین رہتے ہوئے ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ وہ یہ سوچ کر پچھتا رہے تھے کہ چوہی دنیا کے داناؤں نے انہیں خواہ مخواہ اتنا عرصہ دراز تک عمودی حرکت کرنے اور اس جنت ارضی کے حصول سے محروم رکھا۔

شرح حکایت۔

جس طرح چوہے سمجھتے تھے کہ ہماری زیر زمین دنیا ہی اصل دنیا ہے حتیٰ کہ وہ ایک حادثے کی صورت میں باہر آئے اور انہوں نے بیرونی دنیا کی روشنی اور رنگینی دیکھی تو ان کو پتہ چلا کہ وہ تو ایک پست اور مخدوش دنیا میں رہ رہے تھے، کچھ ایسا ہی معاملہ انسان کے ساتھ بھی ہے۔

انسان کے لیے اس وسیع کائنات میں پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے بے حد ذرائع اور وسائل ہیں لیکن بعض دفعہ انسان اپنے ذاتی خیالات کی بنیاد پر خود کو ایک بہت ہی معمولی صورت حال پر لا کر اسی پر رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے نظریات کو کسی معیاری اصول پر پرکھنا نہیں چاہتا، جس کی وجہ سے وہ پسماندہ اور محروم رہ جاتا ہے۔

مولانا رومؒ دیوان شمس تبریزؒ میں فرماتے ہیں۔

"چہ افسردی دریں گوشے چرا تو بر نمی گردی
مگر تو فکر منحوسی کہ جز بر غم نمی گردی

چو آمد موسی عمراں چرا از آل فرعونی
چو آمد عیسی خوشدم چرا ہمدم نمی گردی

چو با حق عہد ہا بستی ز سستی عہد بشکستی
چو خوئے اہل جانبازاں چرا محکم نمی گردی

میان خاک چو موشاں بہ ہر مطبخ رہ سازی
چرا مانند سلطاناں بریں طارم نمی گردی"

تو کیوں افسردہ ایک گوشے میں پڑا ہوا ہے اور حرکت نہیں کرتا۔ تو ایک پسماندہ فکر کا شکار ہے اور جب تک تجھ پر غم نہیں آتا تو حرکت نہیں کرتا۔ جب موسی آچکا ہے تو پھر تو آل فرعون کے ساتھ کیوں ہے۔ اور جب خوشدم عیسی آچکا ہے تو پھر تو اس کا ہمدم کیوں نہیں ہے۔ تو حق کے ساتھ عہد باندھتا ہے وعدے کرتا ہے اور پھر سستی کی وجہ سے اپنے ان عہدوں کو توڑ دیتا ہے۔ تو جانبازوں کی طرح مستحکم و مضبوط کیوں نہیں ہوتا۔ تو چوہوں کی طرح ایک کچن سے دوسرے کچن میں، ایک کھانے والی جگہ سے دوسری جگہ کی طرف راستہ بناتا ہے۔ تم بادشاہوں کی طرح حرکت کیوں نہیں کرتے۔ تم نے اپنے آپ کو چوہا کیوں بنالیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید فرمایا ہے۔
يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ
(سورۃ انشقاق آیت نمبر۔6)

اے انسان تو مشقت میں اپنے رب کی طرف بڑھ رہا ہے اور پھر اس سے ملاقات کرے گا یعنی انسان ایک سٹیج پر رکنے والا نہیں ہے بلکہ وہ محنت اور کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے—

اسی سورۃ انشقاق میں آگے فرمایا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (آیت نمبر 19)

کہ ہم ضرور تمہیں ایک سٹیپ سے اگلے سٹیپ میں، ایک طبق سے اگلے طبق، ایک منزل سے اگلی منزل کی طرف لے کر جائیں گے۔

سورۃ حدید میں فرمایا۔

وَسَارِعُوْآ اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (سورۃ حدید آیت نمبر 21)

کہ تم لوگ اللہ کی مغفرت کی طرف بڑھو اور ان جنتوں کی طرف بڑھو جن کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے—

یعنی ایک طرف تو پست فکر اور نظریات کی وہ چوہوں کی بلیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی ایسی جنتیں ہیں جن کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری صورت حال کو بہتر کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم اس کائنات کے بلند درجوں تک پہنچنے والے بن جائیں۔

بیدار خان کی سائیکل

متن حکایت۔

بیدار خان کو اس کے والدین نے سائیکل لے کر دی۔ وہ ابھی چھوٹا تھا اور سائیکل چلانے پر پوری طرح قادر نہ تھا۔ وہ سائیکل چلاتے ہوئے اپنا توازن برقرار نہ رکھ پاتا اور اس کوشش میں کئی بار زمین پر آ گرتا۔

رفتہ رفتہ وہ بڑا ہو گیا اور اس نے سیٹ پر بیٹھ کر پورے توازن کے ساتھ سائیکل چلانا سیکھ لی۔ اب سائیکل اس کے مکمل کنٹرول میں تھی اور وہ جب اور جیسے چاہتا اسے لیے پھرتا۔ ایک دن اس نے سائیکل کے ہینڈل سے ایک ہاتھ چھوڑ کر دیکھا اور کچھ عرصہ بعد دونوں ہاتھ چھوڑ کر بھی سائیکل چلائی۔

کبھی کبھی وہ زور سے پیڈل مار کر دونوں پاؤں اٹھا لیتا اور دونوں ہاتھ بھی چھوڑ دیتا۔ ایسے میں اسے لگتا کہ وہ سائیکل سے آزاد ہو کر بھی سفر کر سکتا ہے۔

اس نے اپنے ایک دوست کو بتایا کہ وہ چاہتا ہے کہ ایک دن سائیکل چلاتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں اور دونوں ہاتھ اٹھائے اور سائیکل سے آزاد ہوتے ہوئے ہوا میں اڑنا شروع کردے۔اس کے دوست نے اسے بتایا کہ ایسا تو ممکن نہیں اور اگر وہ ایسا کرے گا تو گر کر زخمی ہو جائے گا۔

بیدار خان اسی کوشش میں لگا رہا اور کئی بار گر کے زخمی بھی ہوا، لیکن ان زخموں نے اس کا شوق مزید گہرا ہی کیا۔

اسی کوشش میں ایک خوشگوار صبح کو وہ سائیکل لے کر نکلا۔یہ ایک سیدھی سڑک تھی جس کے دونوں طرف ہریالی تھی۔اس نے زور سے پیڈل گھما کر دونوں پاؤں اٹھا لیے اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کو بھی ہینڈل سے اٹھا کر ہوا میں بلند کر دیا۔اس نے خود کو اوپر کی طرف حرکت دی اور آنکھیں بند کر لیں۔عین اسی لمحے اس کے ہاتھ کسی آسمانی قوت نے تھام لیے۔سائیکل لڑکھڑاتی ہوئی سڑک کے پاس کھائی میں جا گری اور بیدار خان ہوا میں بلند ہو گیا۔

شرح حکایت۔

یہ ایک بچے کی حکایت ہے جس نے سائیکل چلانی سیکھی یعنی توازن قائم کرنا سیکھا۔ سائیکل کے دو پہیوں پر سائیکل کو چلانا توازن قائم کرنے سے عبارت ہے۔پھر اس نے ہاتھ اور پاؤں چھوڑ کر سائیکل چلائی حتیٰ کہ ہوا میں بلند ہو گیا۔بعینہ سالک جب روحانی سفر پر نکلتا ہے تو پہلے پہل توازن قائم کرتا ہے۔پھر رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا روحانی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔

بیدار خان سے مراد ایک بیدار آدمی یعنی روحانی طور پر بیدار آدمی ہے—اور سائیکل چلانا سیکھ لینا توازن قائم کرنا ہے۔جب بیدار خان نے سائیکل چلانا سیکھی تو گویا اس نے

توازن قائم کرنا سیکھا۔اس شرح میں ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ وہ کونسی چیزیں ہیں جن میں توازن قائم کرنا ضروری ہے تاکہ بندہ روحانی طور پر بلند ہو سکے۔

ہم اس کو چار نکات میں سمجھتے ہیں۔

مادی اور روحانی حیثیت میں توازن

ظاہری علم اور باطنی واردات میں توازن

صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں توازن

خلوت اور جلوت میں توازن

مادی حیثیت سے مراد یہ ہے کہ انسان جب دنیا میں رہتا ہے تو اسے رہنے سہنے اور کھانے پینے کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورتی ہوتی ہے۔ جب آدمی روحانی راستے کا مسافر یا سالک بنے تو اس کو ممکن حد تک مالی آسودگی بھی حاصل ہونی چاہیے۔اگر کوئی آدمی مناسب حد تک آسودہ حال نہیں اور وہ روحانی منازل کا مسافر بنے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ آگے بڑھ کر وہ پھر پیچھے دنیا کی طرف مڑ کر دیکھے گا۔اس لیے ضروری ہے کہ ایک سالک یا روحانی سفر پر چلنے والا انسان اپنی مادی اور روحانی ضرورتوں میں توازن پیدا کرے۔

دوسرا توازن ظاہری علم اور باطنی واردات میں توازن ہے۔ ایک نبی کا علم وحی کی صورت میں مکمل ہوتا ہے لیکن عام انسان کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔عام انسان کو روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ ظاہری علم بھی حاصل کرنا چاہیے، ظاہری علم سے مراد معاشرتی اور سائنسی علوم ہیں۔اس کے علاوہ قرآن پاک ،احادیث اور بڑے صوفیا کرام جیسے حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ اور دوسرے عظیم اولیاء کی کتابوں اور ملفوظات کا گہرا

مطالعہ بھی ضروری ہے—اس تمام علم کے ساتھ ساتھ اپنی باطنی ترقی کے لیے تزکیہ نماز،اذکار،صدقات،ریاضت اور خدمت کو اپنانا چاہیے۔

تیسرا توازن صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں توازن ہے۔ صلوٰۃ،پنجگانہ نماز کو کہتے ہیں اور اسکے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنا ہے۔اس کے مقابلے میں زکوٰۃ لوگوں کو اپنامال دیناہے۔ایک آدمی اگر صلوۃ کا قائل،عبادت گزار ہے،لیکن اس کارجحان زکوۃ کی طرف نہیں ہے تو وہ آہستہ آہستہ ایک خشک عبادت گزار بن جاتاہے اور لوگ اس کی ذات سے فوائد حاصل کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔اسی طرح اگر کوئی آدمی زکوۃ کی طرف رجحان رکھتاہے اور لوگوں کے فائدے کے لیے کام کرتاہے لیکن اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط نہیں ہے تو اگرچہ وہ لوگوں کی منفعت کے لیے کام کرتا ہے، لیکن وہ بنیادی مذہبی اخلاقیات سے دور ہونا شروع ہو جاتاہے۔اس لیے ضروری ہے کہ بندہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں توازن قائم کرے۔

چوتھی چیز خلوت اور جلوت میں توازن ہے۔ جس طرح انسان اپنی نجی زندگی میں اپنا تزکیہ کرتاہے،اپنا محاسبہ کرتاہے اور عبادات کرتاہے،ایسے ہی اسے چاہیے کہ وہ جلوت میں جائے یعنی لوگوں میں جائے اور لوگوں کی خدمت، اصلاح اور فلاح و بہبود کی کوشش کرے۔اگر وہ صرف خلوت نشین ہو گا تو جلوت والے سارے کام اس سے رہ جائیں گے لیکن اگر وہ صرف جلوت کی طرف رہے گا اور اپنے لیے وقت نہیں نکالے گا تو وہ اپنا ذاتی تزکیہ کھو بیٹھے گا۔

اللہ تعالی ہمیں ہماری زندگوں میں توازن پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لومڑی درزن

متن حکایت۔

دورستان کے جنگل میں ایک لومڑی رہتی تھی جس نے درزن کا کام سیکھا ہوا تھا۔ جنگل میں جب بھی کوئی جانور مرتا تو یہ اس کی کھال اتار کر اپنے لیے کپڑے سی لیتی۔ یہ کپڑے پہن کر وہ ہر قوم کے فنکشن میں شامل ہوتی اور اپنی اس کاریگری پر فخر محسوس کرتی۔

کبھی کبھی اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا کہ تم ایسا کیوں کرتی ہو۔ جب تمہاری اپنی ذات

لومڑی ہے تو پھر یہ بہروپ کیا معنی رکھتے ہیں۔ اگر تمہیں سنورنا ہی ہے تو اپنی اندرونی ذات کو سنوارو۔ یہ بہروپ صرف ایک وقتی فائدہ ہے جس کو دوام حاصل نہیں ہے۔ لومڑی بہر حال اپنے ضمیر کی اس آواز کو نظر انداز کرتی رہی اور اس نے اپنا درزن کا پیشہ نہ چھوڑا۔

وہ اسی طرح کھالوں کے لباس سی کر خود کو اور دوسروں کو دھوکہ دیتی رہی۔ پھر اچانک ایک دن ایسا ہوا کہ لومڑی بیمار پڑ گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی بیماری میں شدت آ گئی۔ اس دوران اسے اپنے وہ تمام بہروپ یاد آئے جو اس کی ذات کا اصلی حصہ نہ تھے۔ وہ اکیلی رہ گئی، اسے بہت گہرا احساس ہوا کہ اس نے تمام عمر بہروپوں میں ہی گزار دی اور کبھی اپنی اصل ذات کو پہچاننے اور سنوارنے کی کوشش نہ کی۔

شرح حکایت۔

ایک لومڑی مختلف روپ دھارتی ہے لیکن اپنی اصلی ذات کو بھول جاتی ہے۔ جب وہ قریب المرگ ہوتی ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ اس نے ساری زندگی دوسروں کے روپ دھارنے میں گزار دی لیکن اپنی اصل ذات کو تلاش کرنے، پہچاننے اور ترقی دینے کا موقع ضائع کر دیا۔

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اصل ذات کو پہچانے اور پھر اُس ذات کو تزکیے اور اعمال صالحہ کے ساتھ ترقی دے، نہ یہ کہ وہ ساری زندگی اپنے آپ کو دوسروں کے ساتھ آئیڈینٹیفائی کرتا پھرے یا پھر مختلف کرداروں کے ساتھ، عہدوں کے ساتھ، مال ودولت کے ساتھ یا شہرت کے ساتھ چمٹا رہے۔ یہ سب چیزیں ماسک کا کام کرتی ہے یعنی انسان کی اصل شخصیت کو اس سے چھپا دیتی ہیں۔ اور وہ اپنی اصلی ذات کو پہچان کر ترقی نہیں دے سکتا۔

اس بات کو کھولنے کے لیے مثنوی شریف کی ایک حکایت کا سہارا لیتے ہیں جس میں مولانا بیان کرتے ہیں کہ ایک بطخ کا انڈہ بھی باقی مرغی کے انڈوں کے ساتھ مرغی نے سیا ہوتا ہے۔ جب بچے نکلتے ہیں تو بطخ کا بچہ بھی مرغی کے بچوں کے ساتھ پرورش

پاتاہے۔ اگرچہ بطخ خشکی میں اور تری میں بھی یعنی زمین پر اور دریامیں بھی تیر سکتی ہے لیکن وہ بچہ چونکہ مرغی کے زیر سایہ رہ رہاہوتاہے اس لیے وہ بھی مرغی کے چوزوں کی طرح پانی سے خوف کھاتاہے۔

مولانارومؒ فرماتے ہیں۔

"تخم بطی گرچہ مرغ خانہ ات

کردزیرپرچودایہ تربیت

مادرتوبط ان دریابدست

دایہ ات خاکی بدو خشکی پرست

میل دریا کہ دل تواندراست

آں طبیعت جانت راازمادراست

دایہ رابگزارو در خشکی براں

اندرآدربحر معنی چوں بطاں

گر تراما دربترساندزآب

تومترس وسوئے دریاران شتاب"

توبطخ کا بچہ ہے اگرچہ ایک گھریلومرغی نے دایہ کی طرح تیری تربیت کی ہے ۔ تیری اصل ماں دریاوالی بطخ تھی۔ تیری طبیعت کے اندر جودریاکی طرف میل ہے وہ تیری اصل مادربطخ کی وجہ سے ہے۔ تودایہ کو چھوڑدے،دایہ کو خشکی پر چھوڑدے اور دریا میں آجا جس طرح بطخیں دریامیں داخل ہوتی ہیں۔

اگر تیری دایہ مرغی تجھے پانی سے ڈراتی ہے تو نہ ڈر اور دریا کی طرف دوڑ لگا۔ تیری تربیت مرغی نے کی ہے اور تو اس جسم کے زیر سایہ ہے جو خشکی والا ہے۔ لیکن تیرے اندر جو روحانی میلان ہے جو تجھے دریا کے اندر لے جانا چاہتا ہے، تو اس ذوق کے تابع رہ۔ اگر مرغی تجھے دریا سے ڈراتی ہے تو نہ ڈر، تو روحانی زندگی کے مزاج میں داخل ہو۔

بطخ کا بچہ مرغی کے زیر سایہ پلا ہے وہ اپنے آپ کو مرغی کے بچوں سے آئیڈینٹیفائی کرتا ہے لیکن اس کی اصل ذات تو مرغی نہیں ہے اس کی اصل ذات تو بطخ ہے جو خشکی اور تری دونوں جگہ اپنا مقام رکھتی ہے۔یعنی وہ جسمانی زندگی میں بھی اپنا مقام رکھتی ہے اور روحانی زندگی میں بھی اپنا مقام رکھتی ہے۔

ایسے ہی اس لومڑی نے اپنے آپ کو دوسری چیزوں سے آئیڈینٹیفائی کیا۔ ایسے ہی ہم اس زندگی میں اپنے آپ کو جسمانی اور مادی چیزوں سے آئیڈینٹیفائی کرنا شروع کر دیتے ہیں اور یوں اپنی روحانی جہت کو بالکل بھول جاتے ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالی فرماتے ہیں۔

يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكَ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي

کہ اے نفس مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف پلٹ آ بالکل راضی ہو کر۔ میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنتوں میں داخل ہو جا۔

نفس مطمئنہ، نفس کی وہ حالت ہے ہے جس میں نفس مطمئن ہو جاتا ہے۔یعنی اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے اپنے رب کو پہچان لیا ہے۔ ایک نفس کو نفس مطمئنہ بننے تک کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ان مراحل کے دوران وہ پورے

معنوں میں نہ اپنے آپ کو پہچانتا ہے نہ اپنے رب کو ۔ اس کے اندر مختلف میلانات ہوتے ہیں کبھی اس کو مادے کا میلان ہے کبھی اس کو اپنے عہدے کا میلان ہے، کبھی اپنی شہرت کا میلان ہے کبھی مال ودولت اور رشتوں ناطوں کا میلان ہے۔ یہ جتنے میلان اور رجحان ہیں جب انسان ان پر قابو لیتا ہے تو اسے اطمئنان اور کامیابی کی دولت نصیب ہوتی ہے ۔ وہ اپنے رب کی طرف آجاتا ہے اور رب کے بندوں میں شامل ہو جاتا ہے ۔اور پھر وہ رب کی جنتوں میں داخل ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری اصل ذات کو پہچاننے اور اس کو ترقی دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

جبل الکون

متن حکایت۔

فردین گاؤں کے شمال میں ایک بہت بڑا پہاڑ ہے۔ جس کا نام جبل الکون ہے۔ دور سے دیکھنے پر وہ ایک شیر کے دھڑ کی طرح معلوم ہوتا اور گاؤں کے لوگ اسے ایک عظیم فرد کی طرح جانتے تھے۔

ایک دفعہ گاؤں کے کچھ لوگوں نے اس پہاڑ کے قریب جانے کا فیصلہ کیا۔ کئی دنوں کے سفر کے بعد جب وہ اس پہاڑ کے اندر تک پہنچ گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ جس پہاڑ کو وہ ایک فرد کی طرح سمجھتے تھے، دوسرے اعتبار سے وہ ویسا نہ تھا۔

انہوں نے پہاڑ پر طرح طرح کے جنگلات دیکھے۔ ان جنگلات میں طرح طرح کے پرندے، چرندے اور درندے تھے۔

پہاڑ سے کئی چشمے نکلتے تھے جو بل کھاتی ہوئی ندیوں کی شکل میں ڈھل جاتے۔ نہ جانے اس عظیم پہاڑ کے بطن میں اور کیا کیا تھا۔ یہ سب دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے

جب وہ واپس گاؤں آئے اور انہوں نے پیچھے مڑ کر جبل الکون کی طرف دیکھا تو وہ ویسا ہی ایک عظیم الجثہ فرد تھا۔ لوگوں کے لیے جبل الکون کا ایک فرد کی طرح ہونا اور پھر اس انفرادیت میں کثرت ہونا ایک نیا علم تھا۔

کچھ لوگ اب باقاعدہ اس امر میں متفکر ہوتے کہ جبل الکون کی وحدت اور کثرت میں کسی طرح کا ضرور کوئی تعلق ہے۔ فردین گاؤں کے لوگوں نے طے کیا کہ وہ جبل الکون کے بطن میں موجود مزید امکانات اور امکانات کی اس کثرت کے جبل الکون جیسے عظیم فرد سے تعلق کے بارے میں تحقیق کرتے رہیں گے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں کون سے مراد یہ کائنات ہے اور جب ہم جبل الکون کہتے ہیں تو اس سے مراد کائنات کی وحدت ہے۔ یعنی یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں جس میں یہ زمین و آسمان شامل ہیں اس کو دیکھنے اور سمجھنے کے دو رُخ ہیں۔

ایک جہت سے اس کائنات میں وحدت پائی جاتی ہے اور دوسری جہت سے اس کائنات میں کثرت پائی جاتی ہے۔ انسان کا اس کائنات کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ اس کائنات کی وحدت کے اعتبار سے بھی ہے اور کائنات کی کثرت کے اعتبار سے بھی ہے۔ دونوں طرح سے انسان اور کائنات ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

اس کو مثالوں سے سمجھتے ہیں جیسے ایک آدمی دیکھنے میں ہمیں واحد نظر آتا ہے یعنی وہ ایک اکائی کی صورت میں ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس آدمی کے اندرون میں کئی سسٹم ہیں۔ جیسے آدمی کا فزیالوجیکل سسٹم ہے، سائیکالوجیکل سسٹم، برین کا سسٹم ہے اس کا بلڈ سرکولیشن سسٹم ہے جس کو دل کنٹرول کرتا ہے اور ایسے ہی اس کے ہارمونز کا سسٹم ہے۔ دیکھنے میں یہ آدمی اکائی کی صورت میں ہے لیکن اس کے اندر ایک کثرت چل رہی ہے۔

اب جب ہم کسی آدمی کو سمجھتے ہیں اس کو دیکھتے ہیں تو اکثر اس کے ایک ہونے کے حساب سے اس سے معاملہ کرتے ہیں، لیکن اگر ہم کسی آدمی کے اندر چلنے والے سارے نظام کو سمجھیں، اس کی نفسیات، اس کے جینز، اس کی پرورش کا ماحول، اس کا تعلیمی پس منظر دیکھیں اور پھر اس کو اکائی کی شکل میں بھی دیکھیں تو یقیناً اس آدمی کو ہم زیادہ درست طریقے سے سمجھیں گے۔

جب ہم کسی کار کو دیکھتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک کار ہے اور اگر ہم اس کو اس کے پارٹس کے حساب سے دیکھیں تو ہم جانتے ہیں کہ اس کے اندر انجن ہے اور اس کے اندر گئیر بکس ہے اس کے ٹائرز ہیں، باڈی ہے سیٹس ہیں بریک سسٹم ہے۔ اس کے علاوہ الیکٹرانکس کی چیزیں ہیں۔ اگر ہم گاڑی کو اکائی کی شکل میں دیکھتے ہیں تو یہ بھی ایک سمجھ ہے لیکن جب ہم اس کو اس کے پارٹس کے حوالے سے اور اس کے اندر جو سسٹم ہیں اس کے حوالے سے دیکھیں تو یقیناً ہمیں گاڑی کے بارے میں زیادہ سمجھ آتی ہے۔

یہ کائنات وحدت کی شکل میں بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اپنے اجزاء کی کثرت کے حوالے سے بھی اثرانداز ہوتی ہے۔اس کی مثال یوں ہے جیسے دین کے اندر صدقات کا نظام ہے یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں صدقہ وخیرات کرتے ہیں تو اللہ تعالٰی ان کو اس کے بدلے میں مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچاتا ہے اور اُن کے مال و اموال میں اضافہ فرماتا ہے-آپ دیکھیں گے کہ ایک آدمی کراچی میں صدقہ کرے اور پھر اسلام آباد آجائے تو اس کو نیک عمل کے فائدے اسلام آباد میں بھی حاصل ہو جائیں گے۔اگر وہ انگلینڈ میں کوئی نیک کام یا صدقہ کر کے پاکستان آجائے تو ضروری نہیں ہے کہ اس کو اس صدقے کے اجر کے لیے انگلینڈ میں ہی رہنا پڑے گا۔وہ فوائد اس کو پاکستان میں ہی حاصل ہو جائیں گے۔اس لیے کہ یہ کائنات اگرچہ ایک وحدت ہے لیکن اس کائنات کی کثرت کے اجزاء ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں جب ایک جزو کے ساتھ اچھا یا برا معاملہ کیا جائے تو دوسرا جزو اس کو پہچانتا ہے۔اسی حوالے سے مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

"ایں جہاں کوہ است و فعل ماندا

سوئے ما آید نداہا را صدا"

یہ جہاں ایک پہاڑ کی طرح اور ہمارے اعمال ندا کی طرح ہیں۔

جب ہم پہاڑ کی طرف آواز لگاتے ہیں تو اس کی گونج ہماری طرف پلٹ کر آتی ہے۔ہم اس کائنات کی کثرت کو جانیں۔اس کے اندر جو کثرت ہے اس کو بغور دیکھیں اور پھر دیکھیں کہ اس کائنات کے اجزاء کس طرح باہم عمل کرتے ہیں۔ایک جزدوسرے جز

کو کیسے اور کیونکر پہنچاتا ہے۔ایسے میں جو معاملات ہمارے ساتھ پیش آتے ہیں یا جو
معاملات ہم سے پچھلوں کے ساتھ پیش آرہے تھے یا ہم سے اگلوں کے ساتھ پیش
آئینگے ان سے کیسے سبق لیا جاسکتا ہے اور اپنی نجات کا رستہ کیسے پایا جاسکتا ہے۔

متن حکایت۔

ایک معمار نے اپنے رہنے کے لیے کمرہ بنانا شروع کیا۔ زمین ہموار کی، بنیادیں بنائیں اور دیواریں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔

وہ کمرے کی دیواریں اونچی کرتا گیا حتیٰ کہ دیواریں اس کے سر سے بلند ہو گئیں۔ وہ خود دیواروں کے اندر کی طرف تھا، اس نے باہر کھڑے مزدوروں سے کہا کہ مزید اینٹیں اندر کی طرف پھینکو تاکہ وہ دیواروں کو اور اونچا کر سکے۔ یوں کمرے کی دیواریں اتنی بلند ہو گئیں کہ اندر باہر کا رابطہ ناممکن ہو گیا۔

اس معمار کا خود کو دوسروں سے علیحدہ رکھنے کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ اس نے اس کمرے میں کوئی دروازہ نہ رکھا تاکہ کوئی اس کے معمول میں مخل نہ ہو۔ یوں وہ اپنے ہی کمرے کی بلند ہوتی ہوئی دیواروں میں قید ہو گیا۔

جب اسے گھبراہٹ ہوئی تو اس نے اندر سے آوازیں لگائیں کہ مجھے باہر نکالو۔ لیکن اس کی آواز اونچی دیواروں میں دب کے رہ گئی اور کوئی شخص اس کی مدد کو نہ پہنچا۔

شرح حکایت۔

انسان نے اپنے آپ کو قومیت کے لحاظ سے، تعصبات کے لحاظ سے، نظریات کے لحاظ سے، مادی وسائل کے لحاظ سے اور روحانی استعداد کے لحاظ سے مختلف چار دیواریوں میں قید کر رکھا ہے۔ اور پھر وہ اس ذاتی یا گروہی چار دیواری میں دروازہ بھی نہیں رکھنا چاہتا۔ یعنی وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی نہیں چاہتا کہ اس نے اپنے نظریات اور تعصبات کی جو چار دیواری قائم کی ہے کیا واقعی اس چار دیواری کو بنانے کی ضرورت تھی اور کہیں ایسا تو نہیں کہ اس عمل میں کوئی کوتائی ہو گئی ہو۔ نتیجۃً چار دیواری قائم کرنے کا یہ رویہ اور پھر اس میں دروازہ نہ رکھنے کی ضد انسان کو اس کی ترقی کے رستے سے ہٹا کر شدید گھٹن کا شکار کر دیتی ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

"درمیان چوب گوید کرم چوب
مر کرا باشد چنیں حلوای خوب"

لکڑی کے اندر لکڑی کا کیڑا اگا رہا ہوتا ہے کہ مجھ جیسا حلوہ کس نے کھایا ہے۔ ہم لوگ اپنے مختلف طرح کے حالات میں کچھ ایسی ہی صورت حال کا شکار ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں پر ہم کھڑے ہیں بس وہ ہی بہتر صورت حال ہے—اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چار دیواری قائم کرنے اور پھر اس میں دروازہ نہ رکھنے کے نظریے کی قرآن پاک نے کیسے نفی کی ہے۔ اور اس کے برعکس کس طرح کی وسعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نبی پاک ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔
وَمَا أَرْسَلْنَاکَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ(سورۃالانبیاء آیت 107)
کہ ہم نے آپ کو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔
عالمین سے مراد تمام جہان، سارے سیارے، ستارے اور ساری کہکشائیں ہیں، جو کائنات ہم جانتے ہیں وہ بھی اور جو ہم نہیں جانتے وہ بھی۔ نبی پاک ﷺ اس ساری کائنات کے لیے رحمت ہیں،انسان، نباتات اور جمادات سب کے لیے رحمت ہیں۔
یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو جو درجہ دیا تو اس میں چار دیواری قائم نہیں کی، بلکہ اس کو وسیع تر رکھا۔
آللہ تعالی ہمیں ذہنی، نفسیاتی، نظری اور معاشرتی ہر طرح کی چار دیواریوں سے نجات دے۔

متن حکایت۔

سڑک کنارے اونچے پول پر سٹریٹ لائیٹ لگی ہوئی تھی۔ جس کی روشنی سے آس پاس کا علاقہ خوب روشن تھا۔

ساری رات لوگ اس سٹریٹ لائیٹ کے نیچے سے گزرتے رہے۔ ان میں گاڑیاں، موٹر سائیکل اور رکشے بھی تھے۔ اور پیدل چلنے والے مرد، عورت، بچے، امیر، فقیر بھی ،الغرض ہر طرح کے لوگ اس لائیٹ سے یکساں مستفید تھے۔

سٹریٹ لائیٹ رات بھر برابر جلتی رہی۔ وہ اس بات سے قطعی بے نیاز تھی کہ اس کی روشنی سے مستفید ہونے والوں میں کون کون شامل ہے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ایک روشن سٹریٹ لائٹ ہے جو ایک لوہے کے پول پر لگی اپنے ماحول کو روشن کر رہی ہے۔اس سے مراد ایک مستحکم انسانی ذات یا مستحکم انسانی خودی ہے۔ انسان اپنی ذات کو کو ترقی کے مختلف مراحل سے گزار کر ایک روشن تر شخصیت بن جاتا ہے۔

اگر ہم علامہ اقبالؒ کے نظریات کے تناظر میں دیکھیں تو جب انسانی خودی مستحکم ہو جاتی ہے تو پھر خودی سے بے خودی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے پہلے اپنی کتاب اسرار خودی میں انسانی شخصیت کی ترقی اور تکمیل کے مختلف مراحل بیان کیے ہیں۔اور پھر آپ نے اپنی کتاب رموز بے خودی میں بتایا کہ جب انسان اپنی ذات کو روشن تر کر لیتا ہے تو پھر اس پر ایک اگلی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنی مستحکم اور صلاحیت سے مزین خودی کو معاشرے، قوم اور ملت کی خدمت کے لیے بے خود کر دیتا ہے، یعنی اپنی خدمات کو عام کر دیتا ہے۔ وہ سٹریٹ لائیٹ بھی کچھ ایسے ہی بے خود تھی اور اس کی خدمت کسی انا کے بغیر سب کے لیے عام تھی۔

نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔

" خَيْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاس"

لوگوں میں بہتر وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، نفع پہنچاتا ہے۔ جس طرح وہ سٹریٹ لائٹ اپنی ذات پر قائم ہو کر اپنی روشنی ہموار طریقے سے پھیلا رہی تھی جس سے سب لوگ فائدہ مند ہو رہے تھے—بعینہ ایک ایسا انسان جس کی ذات سے لوگوں کو فائدہ پہنچے اس کو نبی پاک ﷺ نے بہترین انسان فرمایا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایک صحابی نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا اسلام بہتر ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ۔

فرمایا کہ اچھا اسلام یہ ہے کہ تو کھانا کھلائے اور سلام کرے جس کو تو جانتا ہے اور جس کو تو نہیں بھی جانتا۔ یعنی تو نیکی کو بلا امتیاز بغیر کسی تعصب کے عام کر دے۔ یہی کام وہ سٹریٹ لائٹ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کر رہی تھی۔ ہر طرح کے لوگ ادھر سے گزر رہے تھے گاڑیوں پر بھی، پیدل بھی، عورتیں بھی اور مرد بھی، کالے بھی اور گورے بھی، لیکن اس سٹریٹ لائیٹ کو اپنی روشنی کے پھیلانے میں کسی بھی امتیاز سے واسطہ نہیں تھا۔ وہ ایک ہموار روشنی پھیلا رہی تھی جس سے سب فائدہ مند ہو رہے تھے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

"کار مرداں روشنی و گرمی است

کار دوناں حیلہ و بے شرمی است"

فرماتے ہیں جو بڑے لوگ ہیں ان کا کام روشنی اور گرمی ہے۔ یعنی وہ معاشرے میں روشنی پھیلاتے ہیں، فلاح و بہبود کا کام کرتے ہیں۔ اور جو چھوٹے لوگ ہیں وہ حیلہ و حجت سے کام لیتے ہیں۔ وہ حقیر قسم کے مقاصد میں لگے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس جہت میں کوشش کریں جس سے ہماری ذات مستحکم اور روشن ہو جائے، اور پھر ہم اس روشنی کو معاشرے، قوم، ملت اور انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کریں۔

حلوائی کی دکان

متن حکایات۔

ایک لڑکا حلوائی کی دکان پہ بھرتی ہوا۔ یہ مٹھائیوں اور حلووں کی دکان تھی، جہاں ہر وقت رش لگا رہتا۔ ایک دن یہ لڑکا دودھ کے بڑے کڑاہ کے پاس کھڑا تھا۔ اس کا استاد ابلتے دودھ کے کڑاہ میں کڑچھا چلا رہا تھا۔ استاد نے اس دودھ کو کھوئے میں بدلنا تھا اور پھر اس سے رنگا رنگ مٹھائیاں تیار ہونا تھیں۔

لڑکے نے اچانک حلوائی سے سوال کیا۔ استاد اگر گائیں دودھ دینا ہی چھوڑ دیں تو پھر ہم یہ رنگا رنگ مٹھائیاں کیسے تیار کریں گے۔ حلوائی نے لڑکے کی بات سنی اور قدرے سخت لہجے میں جواب دیا، دودھ دینا گائے کا کام ہے اور تمہیں اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا کام مٹھائیاں بنانا ہے اور تم صرف اسی طرف توجہ دو۔

شرح حکایت۔

یہ ایک لڑکے کی کہانی ہے جو حلوائی کی دکان پر مٹھائیوں کا کام سیکھنے کے لیے بھرتی ہوتا ہے۔ ایک دن دکان میں دودھ کے ایک بڑے کڑاہ کے پاس کھڑے ہو کر اس کا دھیان مٹھائیاں بنانے کا طریقہ سیکھنے کی بجائے اس طرف چلا جاتا ہے کہ اگر گائیں دودھ دینا چھوڑ دیں تو پھر یہ مٹھائی کا کاروبار کیسے چلے گا۔ اصل میں وہ لڑکا اس بات سے لاعلم تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں، اس کائنات کا نظام محکمات پر قائم ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ المنافقون آیت نمبر 7)

اور اللہ تعالیٰ کے پاس آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں—

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (سورۃ فاطر آیت 43)

تو اللہ تعالیٰ کی سنت کو تبدیل ہوتے نہیں دیکھے گا۔

انسان کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ اللہ کے خزانوں پر بھروسہ کرے اور پھر اپنے حصے کا کام کرے۔ یعنی انسان محکمات اور مسلمات کا علم حاصل کرے اور اس میں تشکیک کا رویہ نہ اپنائے۔ ورنہ وہ وقت ضائع کرے گا اور ترقی کی بجائے تنزل کا شکار ہو جائے گا۔ وہ کائنات کے محکمات اور مسلمات کو سمجھے اور اس کے مطابق اپنے فرائض ادا کرے۔ اس کائنات میں موجود امکانات کو سمجھے اور انہیں کام میں لا کر نئی نئی ایجادات کرے۔ یوں اپنے اور دوسروں کے لیئے علوم و فنون کے نئے نئے باب کھولے۔

مادے کی طرح انسان کا ذہن اور اس کی نفسیات بھی کچھ محکمات اور مسلمات پر قائم ہیں ۔انسان کا اس جہان میں جو لاکھوں سالوں کا سفر ہے اس سفر کے دوران انسان کا ذہن اور اس کی نفسیات کا کن کن اصولوں سے کیسے کیسے ارتقاء ہوا ہے انسان اس کو سمجھے اور پھر محکم اصولوں کی روشنی میں ایک مثبت ذہنی اور نفسیاتی ترقی کے لیے کوشش کرے۔

ایسے ہی انسان کی روحانی جہت میں ترقی کی بات ہے۔ ہم اس اصول کو سمجھیں کہ روح کو جسم پر فوقیت حاصل ہے۔اور جب سے اس کے خالق نے تخلیق کیا ہے روح کا اپنے خالق کے ساتھ ایک تعلق ہے۔ ان دو مسلمات کو تسلیم کرتے ہوئے ہم اپنی روحانی ترقی کی کوشش کریں اور اپنی انفرادی روح کو ترقی دیں، تاکہ وہ اس جسمانی گرفت سے زیادہ سے زیادہ آزاد ہو کر روحانی جہتوں میں پرواز کرنے کے قابل ہو سکے۔

جیسے ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر آدمی کو ہر سٹیٹس میں رہنے کا حق نہیں ہے۔یعنی گریڈ۔ 1 والا ملازم اپنے سٹیٹس کے لحاظ سے ایک گریڈ۔ 21 والے ملازم کی پوزیشن میں داخل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس نے اپنے اندر وہ والی صلاحیت ہی پیدا نہیں کی۔اسی طرح جو اعلیٰ جنتیں ہیں اس میں رہنے کے لیے ایک خاص قسم کی روحانی استعداد چاہیے۔ایک خاص لیول کا تزکیہ چاہیے اور ایک خاص لیول کا علم چاہیے۔ اعلی روحانی اور آسمانی مدارج کائنات کے بنیادی اصولوں کو سمجھ کر اور پھر ان اصولوں کی روشنی میں محنت کر کے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

مشروب ساز کمپنی

متن حکایت۔

ایک مشروب ساز کمپنی اپنا مشروب ایک ہی وقت میں تین مختلف قسم کی پیکنگ میں فروخت کے لیے مارکیٹ میں لائی۔ پہلی قسم گتے کی پیکنگ تھی، دوسری قسم شیشے کی پیکنگ اور تیسری قسم ٹِن کی پیکنگ تھی۔ مشروب کی قیمت میں پیکنگ کے لحاظ سے فرق تھا۔ ہر ایک قسم کی پیکنگ دوسری قسم کی پیکنگ سے ممتاز تھی۔

ایک گاہک نے اس کمپنی کا مشروب تینوں قسم کی پیکنگ میں پیا۔ اگرچہ ان تینوں کی قیمت آپس میں مختلف تھی لیکن گاہک کو ان کے ذائقے میں ذرا بھر فرق محسوس نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر کے اس گاہک کو بہت کوفت ہوئی کہ خواہ مخواہ اس نے تین مختلف پیکنگ والے مشروب پیے جبکہ ان کا ذائقہ ایک ہی تھا۔ اسے اس بات پر افسوس تھا کہ بیرونی پیکنگ کی تبدیلی دھوکے کا باعث بنی جبکہ اندرونی مشروب تو ایک ہی تھا۔

شرح حکایت۔

ایک انسان جس کی اخلاقی تربیت نہ ہوئی ہو اور وہ کسی معیاری طریقہ پر نہ چل رہا ہو تو اگرچہ اس انسان کی بیرونی ہیئت تبدیل ہو جاتی جیسے وہ ایک روایتی عالم بن گیا یا ایک بظاہر روحانی آدمی بن گیا لیکن اس کے بنیادی اخلاقیات ترقی نہیں کرتے۔ جب اخلاقی تربیت نہ ہو تو لوگ محسوس کرتے ہیں کہ ایک عام انسان، ایک روایتی عالم یا ایک بظاہر متصوف آدمی اپنی بیرونی ہیئت کے فرق کے باوجود ایک جیسے غیر سنجیدہ درجوں پر ہی کھڑے ہیں۔یوں یہ بات معاشرے پر برے اثرات ڈالتی ہے۔

اگر کوئی عالم، سائنٹسٹ، پروفیسر یا نام نہاد صوفی بنیادی اخلاقی تربیت کے مراحل سے نہیں گزرا تو بنیادی اخلاقیات کے اصولوں سے عاری ہونے کی وجہ سے اپنے منصب پر بیٹھ کر لوگوں اور معاشرے کے لیے نقصان کا باعث ہو گا۔

جب آدمی کم علمی کے ساتھ چل رہا ہوتا ہے تو اس وجہ سے بھی اس کے اندر اخلاقی گراوٹ آجاتی ہے۔ مثلاً ایک بظاہر روحانی آدمی جاڑ پھونک سے ایک آدمی کا سر درد ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس آدمی کا بلڈ پریشر 180 یا 200 ہے۔ ایسے میں اس کو سمجھنا چاہیے کہ موجودہ زمانے میں میڈیکل سائنس سے ہم انسان کے جسم میں جھانک کر بیماری کی وجہ جان سکتے ہیں۔ جب اسے یہ معلوم نہیں کہ اس آدمی کی اندرونی کیفیت کیا ہے اور وہ صرف اپنی اسی پریکٹس پر مصر ہے تو ایسے میں وہ نقصان کا باعث بنے گا۔

بنیادی طور پر روحانی راستے پر چلنے کا مطلب انسانی ذات کا تزکیہ ہے۔ اپنے نفس کی ترقی دینا اور آسمانی ہدایات کی روشنی میں معاشرے اور کائنات کی منفعت کی موافقت میں لانا ہے۔ نفس کو مطمئن کرنا ہے اور مطمئن نفس کے ساتھ اپنے رب کی طرف بڑھنا

ہے ۔ اپنے رب سے تعلق مضبوط کرنا ہے ۔یوں کسی روحانی بندے کا میڈیکل سپیشلسٹ ہونا ضروری نہیں، اللہ نے اپنے انبیاء اوراولیاء کو ضرور کچھ ایسی خاص طاقتیں دی ہیں لیکن اس کا اطلاق بالعموم عام لوگوں پر نہیں ہوتا۔اس لیے جب نام نہاد متصوف لوگ مستقل طورپر لوگوں کے علاج کا دعوی کرتے ہیں تو وہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اعلیٰ اخلاقیات سے مزین فرمائے۔وہ ہمیں اعلیٰ اخلاقیات کا علم حاصل کرنے اور اسے عمل میں لانے کی توفیق عطا فرمائے۔ صرف لبادے اوڑھ لینے سے یا شخصیت کی بیرونی ہیئت تبدیل کرنے سے انسان کے اندرون میں تبدیلی نہیں آتی۔ہم نے اللہ تعالیٰ کے پاس اپنی روح کے ساتھ جانا ہے اورروح کی ترقی اخلاقیات کی مرہون منت ہے نہ کہ ہمارے جسم کے بیرونی رنگوں سے۔

متن حکایت۔

دبئی ائیرپورٹ پر ایک مسافر پرفیوم کی دکان میں داخل ہوا۔ سیلز گرل نے اسے مختلف برانڈز کی پرفیوم دکھائیں۔ کبھی وہ ایک پرفیوم سونگھتا کبھی دوسری۔ متواتر چند پرفیوم سونگھنے پر اس کی قوت شامہ جامد ہوگئی اور اسے مختلف خوشبوؤں میں فرق محسوس ہونا بند ہوگیا۔

یہ دیکھ کر سیلز گرل نے پاس ایک برتن میں پڑے کافی بینز (Coffee Beans)

اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے کافی بینز کو سونگھا۔ ان کی تلخ مہک سے اسے ناخوشگوار احساس تو ہوا لیکن اس عمل سے اس کی خوشبوؤں کو سونگھنے اور ان میں امتیاز کرنے کی صلاحیت واپس لوٹ آئی۔

سیلز گرل نے چند پرفیومز کے بعد کافی بینز سونگھانے کا یہی عمل کچھ بار اور دہرایا۔ حتیٰ کی اس مسافر نے اپنی پسند کی پرفیوم خریدی اور فلائیٹ لے کر اپنے ملک کے لیے عازم سفر ہوا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں دوبئی ائیر پورٹ سے مراد ایک ٹرانزٹ ائیر پورٹ ہے۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں اگر ہم نے بالفرض یورپ سے ایمریٹس ائیر لائن سے پاکستان آنا ہے تو ہم پہلے کسی یورپی ملک سے بذریعہ ائیر لائن دوبئی آئیں گے اور پھر ٹرانزٹ ہو کے دوسری فلائیٹ لے کر اسلام آباد آئیں گے۔ یوں دبئی یورپ اور اسلام آباد کے درمیان ایک ٹرانزٹ ائیر پورٹ کا کام کریگا۔

نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ۔

(دنیا میں ایسے رہو جیسے تم ایک مسافر ہو)۔

اس دوبئی ائیر پورٹ کے ٹرانزٹ کے رول کو ہم دو طرح سے سمجھ سکتے ہیں اس دنیا میں آنے سے پہلے ہماری ارواح ایک اور دنیا میں موجود تھیں جسے ہم عالم اروح بھی کہہ سکتے ہیں اور اس دنیا سے دوبارہ سفر کر کے ہم ایک اور مقام کی طرف چلے جائیں گے جسے ہم اپنے رب کی طرف پہنچنا بھی کہہ سکتے ہیں۔ تو گویا یہ دنیا ایک ٹرانزٹ ہے۔ ٹرانزٹ ائیر پورٹ ہے۔

اگر ہم دوبئی ائیر پورٹ کو جسم سمجھیں اور ہماری روح عالم ارواح سے اس جسم میں داخل ہو گئی ہے۔ تو یہ جسم ہمارے لیے ایک ٹرانزٹ ائیر پورٹ ہے یہاں سے یہ روح پھر دوبارہ اگلے مقام کی طرف روانہ ہو جائیگی۔

اس مسافر کو پتہ ہے کہ اس نے اس ٹرانزٹ ائیر پورٹ سے اپنے اصل وطن کی طرف روانہ ہو جانا ہے۔ وہ وہاں سے پرفیوم خرید رہا ہے۔ پرفیوم خریدنے سے مراد نفس کو اطمئنان کی حالت تک پہنچانا ہے۔ خوشبو کی خریداری کے دوران کافی بینز کی تلخ مہک سے واسطہ پڑنا ویسا ہی ہے جیسے اس دنیا میں ہمیں اپنے نفس کو اطمینان کی کیفیت تک پہنچانے کے لیے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ جیسے وہ مسافر پرفیوم خرید کر فلائٹ لے کر اصلی وطن کو روانہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی ہم توفیق الہی سے مطمئن نفس کے ساتھ اپنے رب کے قرب میں پہنچ سکتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دوبئی ائیر پورٹ پر ہر طرح کی رنگینی ہے روشنیاں ہیں، چمک دمک ہے ۔ طرح طرح کی فرنچائزز ہیں۔ جب مسافر وہاں پر اترتا ہے اور لاؤنجز سے گزرتا ہے تو اگرچہ بڑے رنگین مناظر ہوتے ہیں لیکن مسافر کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ میرا دو تین گھنٹے کا ٹرانزٹ ہے اور اس کے بعد میں نے فلائیٹ لینی ہے جو اگلے وطن کو روانہ ہو رہی ہے۔ ایسے میں وہ ان چیزوں میں کسی خاص حد دلچسپی تو لیتا ہے لیکن زیادہ دل نہیں لگاتا۔

ہمیں بھی یہی چاہیے کہ اس دنیا کے بازار میں اسی حد تک ہی دل لگائیں جتنا ہمیں یہاں رکنا ہے۔ اپنے لیے خوشبوؤں کا اہتمام کریں اور مقررہ وقت پر اپنے اگلے وطن کی طرف پرواز کر جائیں۔

گیدڑپور

متن حکایت۔

کسی جنگل میں گیدڑوں نے اپنی ایک الگ بستی قائم کرر کھی تھی جس کا نام گیدڑپور تھا۔ اس بستی کے قیام میں گیدڑوں کے سردار کی یہ فکر کارفرما تھی کہ اس کی قوم اپنی گیدڑ ثقافت اور افکار و نظریات سے بندھی رہے۔ایک ایسی بستی جس میں رہتے ہوئے گیدڑ ثقافت کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات کیے جاسکیں۔

اسی فکر کو مد نظر رکھتے ہوئے گیدڑوں کے ٹھکانوں میں ایسی مٹی ڈلوائی گئی جس کا رنگ گیدڑوں کے رنگ سے مشابہ تھا۔ دروازوں کے پاس گیدڑوں کے سروں کے مجسمے نصب کیے گئے تاکہ ہر پیر و جواں کو گھر آتے جاتے اپنے گیدڑپن کا پورا طرح احساس ہو۔ گیدڑوں کے سردار کے حکم پر ان کے آباء واجداد کے ڈھانچے جنگل سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے گئے اور گیدڑپور کی دیواروں اور درختوں پر جابجا آویزاں کر دیے گئے۔

یوں وہ گیدڑ قوم پوری طرح گیدڑ پن کے حصار میں تھی۔ وہ گیدڑ پیدا ہوتے، گیدڑ جوان ہوتے، گیدڑ بوڑھے ہوتے اور اسی گیدڑ پن میں ہی مر جاتے۔ کسی بھی لمحے گیدڑ پن سے باہر نہ آتے اور اس طرزِ حیات پر نسل در نسل فخر کرتے۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک نوجوان گیدڑ جسے باہر کی دنیا دیکھنے کا شوق تھا، گیدڑ پور سے بھاگ کر مرکزی جنگل میں چلا آیا۔ گیدڑ سردار یہ معلوم پڑنے پر بہت غضبناک ہوا اور اس نے اعلان کیا کہ اس نوجوان کو گیدڑ پور سے بھاگنے پر عبرت ناک سزا دی جائے۔ چناچہ اس نے دو گیدڑ سپاہی اس باغی گیدڑ کو پکڑنے کے لیے جنگل کی طرف روانہ کیے۔

جب نوجوان گیدڑ کو یہ پتا چلا تو وہ چوکنا ہو گیا۔ جنگل کی آزاد فضاء میں رہنے کے بعد گیدڑ پور واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جنگل کے بادشاہ کو گیدڑ پور کے مظالم، اپنے وہاں سے بھاگنے اور گیدڑ سپاہیوں کے اس کے تعاقب میں ہونے کی ساری کہانی سنائی اور اور پناہ کی درخواست کر دی۔

بادشاہ نے اس کی پناہ کی درخواست قبول کی اور شیروں کی ایک کچھاڑ میں رہنے کے لیے جگہ فراہم کر دی۔ جب گیدڑ سپاہیوں کو پتا چلا کہ ان کا باغی گیدڑ شیروں کی پناہ میں ہے تو وہ کچھ کیے بغیر گیدڑ پور واپس لوٹ گئے اور اپنے گیدڑ سردار کو اس امر کی اطلاع دی۔ سردار یہ سن کر غصے میں آ گیا اور اس نے شیروں سے فوراً جنگ کر کے اپنے باغی گیدڑ کو حراست میں لینے کا اعلان کر دیا۔ چناچہ چالیس گیدڑوں کا ایک دستہ تیار کر کے جنگل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

شیروں کو جب اس لشکر کی خبر ہوئی تو وہ مسکرا دیے اور گیدڑوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ جوں ہی گیدڑوں کی فوج شیروں کی کچھار کے قریب پہنچی شیر غُرا کر ان پر حملہ آور ہو گئے۔ گیدڑوں اور شیروں کی آوازوں سے پورا جنگل گونج اٹھا۔

اس معرکے میں کئی گیدڑ مارے گئے۔ جو بچ گئے وہ زخمی ہو کر ناکام و نامراد واپس گیدڑپور کی طرف دوڑ نکلے۔

جنگ ختم ہوتے ہی جنگل کے جانوروں میں اس جنگ کے بارے میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ ان چہ میگوئیوں کو ختم کرنے کے لیے جنگل کے بادشاہ شیر نے ایک جلسے کا اعلان کیا جس میں کچھ اہم اعلانات متوقع تھے۔

روزِ مقررہ پر سب جانور جمع ہوئے۔ گیدڑپور کے مقیم بھی بڑی تعداد میں جلسے میں شریک تھے۔ ایک سٹیج تیار کیا گیا جس پر چڑھ کر شیر نے تقریر کرنا تھی۔ شیر سٹیج پر آیا، اس نے گیدڑپور کے ناجائز قیام اور شیروں اور گیدڑوں کی جنگ کے حوالے سے تمام جانوروں کو آگاہ کیا۔ تمام جانور پوری طرح بادشاہ شیر کی طرف متوجہ تھے۔

تقریر کے آخر میں شیر نے بلند آواز سے تین نکاتی اعلامیہ جاری کیا۔

1- کسی بھی قوم کے جانور اپنی نسل کو اپنی خود ساختہ حدود اور رسومات میں پابند نہیں کریں گے۔

2- جنگل میں زندگی فطرت کے بنیادی اصولوں کے مطابق گزاری جائیگی۔

3- جنگل کی تازہ آب و ہوا، وسعت اور مواقع ہر قوم کا بنیادی حق تصور ہو گا۔

یہ اعلامیہ سنتے ہی جنگل کے جانور خوشی سے جھوم اٹھے اور جنگل میں جشن کا سامان ہو گیا۔ اس اعلامیے کے چند دنوں بعد ہی گیدڑپور کی بستی اجاڑ اور ویران ہو گئی۔

شرح حکایت۔

اس حکایت کا سبق یہ ہے کہ انسان اپنے خود ساختہ عقائد، جعت پسندی، کوتاہ نظری، فرقہ پرستی اور نسلی تعصب سے بلند تر ہو جائے۔ وہ علم حاصل کرے۔ علم اور حقیقت کے بنیادی اصولوں کے ساتھ اپنا موازنہ کرے اور اپنی ذات کو ترقی دے تاکہ وہ اپنے آپ کو ان تمام عوامل کے چنگل سے چھڑا سکے جو اس کو رجعت پسندی کی طرف مائل کرتے ہیں۔

قرآن پاک نے اس پریکٹس کو جس میں انسان رجعت پسندی اور گھٹن کا شکار ہو سختی سے منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سورۃ بقرہ میں فرمایا۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ۔

کہ یہ پھر بھی اپنے آباء کی پیروی کریں گے اگرچہ ان کو کچھ عقل نہیں تھی اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے۔ یعنی کیا یہ لوگ پھر بھی اسی طرز زندگی پر اصرار کریں گے جس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں — لیکن چونکہ ان کے آباء مسلسل اس راہ پر چلتے آرہے تھے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اسی راہ پر چلیں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ لوگ کہتے ہیں۔

بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔

کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے اباء کو دیکھا ہے کہ وہ اس طرح ہی کرتے تھے۔

جب انسان کسی طرز زندگی کو دیکھتا ہے جو پیچھے سے چلی آرہی ہوتی ہے تو اسی پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ صرف پیچھے سے چلے آنا کسی بات کے حقیقت ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ بلکہ انسان کو چاہیے اپنے طرز زندگی اور مقاصد کو حقیقی علمی بنیادوں پر پرکھے۔ وہ اپنی سمجھ کو کسی مستند علم کی کسوٹی پر پرکھے کہ کیا واقعی میں صحیح نہج پر ہوں۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ تصوف میں ایسے طریقے اختیار کیے ہوئے ہیں جو قرآن و حدیث میں بیان کیے گئے تصوف کو اصولوں کے منافی ہیں۔ایسے میں نئے آدمی کو چاہیے کہ وہ اس چنگل میں نہ پھنسے بلکہ قرآن و حدیث اور عظیم صوفیا کی تعلیمات سے آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کرے۔ایسے ہی معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی علوم ہیں جنہیں ان علوم کے اعلیٰ ترین معیاروں پر پرکھنا ضروری ہے۔

انسان کو چاہیے کہ دنیا میں اعلیٰ علوم حاصل کرے، اعلیٰ سے اعلیٰ ذرائع سے استفادہ کرے اور پھر اپنی زندگی کی ہر طرح کی پریکٹس کو چاہے اس کی ذات کے حوالے سے ہو یا معاشرے کے حوالے سے، مادیت کے حوالے سے ہو یا روحانیت کے حوالے سے، پرکھے اور اپنے آپ کو اپڈیٹ کرے۔

لفٹ

متن حکایت۔

ایک آدمی آسمان کو چھوتی سو منزلہ عمارت میں داخل ہوا۔اس عمارت میں دنیا کی بڑی بڑی کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ وہ لابی میں لگی لفٹ کے پاس آیا۔ لفٹ میں داخل ہوا اور مختلف بٹن دبانا شروع کر دیے۔یوں لفٹ کبھی اوپر جاتی اور کبھی نیچے۔ جیسے کسی نے منزل کا تعین ہی نہ کیا ہو۔

جب لفٹ کسی فلور پہ رکتی اور دروازہ کھلتا تو اس کے سامنے کسی ایک کمپنی کا دفتر ہوتا۔وہ لفٹ میں ہی کھڑا اس دفتر کو دیکھتا اور کوئی دوسرا بٹن دبا دیتا۔یوں وہ کئی فلورز پہ گیا لیکن کسی دفتر میں داخل نہ ہوا۔اجنبیوں کی طرح اوپر نیچے گھومتا رہا۔کچھ دیر کے بعد اس کثیر المنزلہ عمارت کی سیکورٹی کو اس بات کی خبر ہوئی کہ ایک آدمی بے مقصد لفٹ میں گھوم رہا ہے، چناچہ اس کو پکڑ کر لفٹ سے باہر نکال دیا گیا۔

شرح حکایت۔

اس بلڈ نگ سے مراد ہماری یہ کائنات ہے۔اس کی سو منزلیں جس میں مختلف دفاتر قائم ہیں،ان سے مراد اس کائنات کے متنوع حقائق ہیں۔

انسان اس دنیا میں آزمائش اور ترقی کے لیے آیا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کا آج اس کے کل سے بہتر نہیں وہ تباہ ہو گیا۔اس کا مطلب ہے کہ انسان نے ہر روز اپنی روح اور نفس کو ترقی دینی ہے۔ یہ سو منزلیں اور دفاتر انسان کی ترقی کرنے کے متنوع پہلو اور ذرائع ہیں۔

انسان کی اپنی حقیقیت کے بھی کئی پہلو ہیں۔ جیسے انسان کی حیاتیاتی حقیقت ہے۔ذہنی، نفسیاتی اور روحانی حقیقت ہے۔ایسے ہی اس کائنات کی حقیقت کے کئی پہلو ہیں۔ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور اس کائنات میں موجود ستارے،سیارے اور کہکشائیں کیا ہیں اور کیونکر ہیں۔

پھر اس انسان کا اور کائنات کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ تو یہ سب گویا اس سو منزلہ عمارت کے دفاتر ہیں۔ اب اگرچہ اس بلڈ نگ کی سو منزلیں ہیں لیکن بحر حال یہ بلڈ نگ تو ایک ہے۔ ایسے ہی اس کائنات میں اگرچہ متنوع حقائق ہیں لیکن ان سب حقائق کا آپس میں ایک ربط بھی ہے۔ پھر مربوط ہو کر ان کا اپنے خالق کے ساتھ ایک تعلق ہے۔

اگر کوئی آدمی اس بلڈ نگ میں فضول گھومتا رہے اور کسی بھی دفتر میں داخل نہ ہو تو اس کی یہ زندگی رائیگاں چلی جائیگی۔ انسان کو چاہیے کہ کسی نہ کسی ایک دفتر میں داخل ہو۔پہلے کسی ایک حقیقت کو سمجھے۔جب وہ کسی ایک حقیقت کو سمجھ کر اپنی گرفت میں

لے لے گا تو چونکہ یہ کائنات اپنے اندر ایک وحدت لیے ہوئے ہے تو لازمی طور پر اس کا باقی حقائق کے ساتھ بھی کنکشن بننا شروع ہو جائے گا اور وہ کائنات کی اصل حقیقت کو سمجھنا شروع کر دے گا۔

انسان کا اپنی حقیقت کو سمجھنا اور پھر کائنات کو سمجھنا اسے کائنات کے خالق کی طرف لے جاتا ہے اور یہ سارے علوم اور معارف انسان کے روحانی تزکیہ اور ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ذات اور پھر کائنات یعنی آفاق کے حقائق کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

لان کی باڑ

متن حکایت۔

کسی شہر کے وسط میں خوبصورت باغ تھا۔ جس میں سر سبز گھاس، پھولوں کی کیاریاں، دراز قامت درخت اور پھلوں کے پودے تھے۔ باغ کے مختلف حصوں کو سر سبز باڑوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا کیا گیا تھا۔

ایک دن مزید باڑ لگانے کی ضرورت پڑی تو نرسری سے باڑ کے ننھے ننھے پودے لائے گئے اور انہیں ایک لائن میں ایک تیار شدہ کیاری میں لگا دیا گیا۔ اس کیاری کو پانی اور کھاد ملنا شروع ہوئی اور یوں کچھ ہی عرصے میں یہ باڑ کے پودے بڑھنا شروع ہو گئے۔

یہ پودے بہت خوش تھے کہ نرسری سے نکل کر باغ میں آئے ہیں اور خوب کھانا پینا مل رہا ہے۔ جب انہوں نے مزید سر نکالا تو باغ کے مالی نے انہیں اوپر سے اور سائیڈوں سے کتر دیا تا کہ یہ باڑ اپنے مقررہ سائز کے اندر رہے۔ یوں کترے جانے پر یہ پودے بہت چیخے چلائے لیکن ان کے پاؤں زمین میں گڑھے ہوئے تھے اور کوئی جائے رفتن

نہیں تھی۔ پھر یہی ظلم ہر کچھ روز بعد ہوتا کہ مالی ان کو کتر دیتا۔ رفتہ رفتہ یہ پودے کترے جانے کے عادی ہو گئے اور اس ظلم کا احساس ان کے دل سے جاتا رہا۔

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ باغ کا مالی بیمار ہو گیا اور کئی روز کام کے لیے باغ میں نہ آ سکا۔ اس دوران باڑ کے پودوں کو اپنے کترے نہ جانے پر اکتاہٹ ہونے لگی۔ وہ منتظر تھے کہ کب مالی آئے اور انہیں کترے تاکہ وہ سکون پائیں۔

باغ کے ایک کونے میں کھڑا دراز قامت درخت جو اس باغ پر گہری نظر رکھے ہوا تھا باڑ کے پودوں کے اپنی نشوونما کے سلبی عوامل کو قبول کرنے کے اس رویے کو دیکھ کر بہت غمگیں ہوا، لیکن کیا ہو سکتا تھا ان باڑ کے پودوں نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو اپنے لیے روا سمجھ کر اپنے آپ کو ویسے ہی ڈھال لیا تھا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ استحصال کسی بھی شعبہ زندگی میں قابل قبول نہیں۔ لوگوں کا مالی لحاظ سے استحصال کیا جائے، یا معاشرتی لحاظ سے استحصال، لوگوں کی طبقہ بندی کی جائے کچھ کو پست کیا جائے کچھ کو بالا کیا جائے، یا پھر سیاسی استحصال ہو جس میں کچھ مخصوص لوگ ہی امور مملکت پر قابض ہوں اور باقی لوگوں کو مستقل زیر دست کیا جائے، لوگوں کا علمی استحصال ہو یا پھر روحانی استحصال ہو کہ انہیں کسی روایت کے زیر اثر علمی یا روحانی طور پر پست کیا جائے۔ استحصال کی یہ ساری شکلیں قابل مذمت ہیں۔

جب مسلسل استحصال کیا جاتا ہے تو لوگ اس استحصال کو نفسیاتی طور پر قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں جو کہ ایک اور بھی بہت خطرناک صورتحال ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم

معاشرے میں موجود طبقاتی تقسیم کا حصہ نہ بنیں۔ لوگوں کو ان کا حق پورے کا پورا دیں تاکہ زندگی میں ان کو پنپنے کا موقع ملے۔ ان کو مادی، معاشرتی، علمی، دینی اور روحانی ہر شعبے میں ترقی کرنے کا برابر موقع ملے۔

کسان اور بچھڑا

متنِ حکایت۔

کسی کسان کے ہاں ایک گائے نے بچھڑا جنا۔ اس نے بچھڑے کو گائے سے الگ باندھا اور کم از کم دودھ پینے دیا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دودھ خود اپنے استعمال میں لائے۔ بچھڑے کو تکلیف تھی لیکن اس بات کا ادراک نہیں تھا کہ کسان اس کی حق تلفی کر رہا ہے۔ وہ اپنی دھن میں اچھلتا کودتا رہا۔

جب بچھڑا کچھ بڑا ہوا تو کسان نے اسے گائے سے بالکل جدا کر دیا۔ اگرچہ اس کی دودھ پینے کی عمر ابھی باقی تھی مگر اسے گھاس پھوس کھانے پہ لگا دیا۔ بچھڑے کو پھر بھی کچھ ادراک نہ ہوا اور وہ یوں ہی اچھلتا کودتا رہا۔ جب بچھڑا جوان ہوا تو کسان نے فیصلہ کیا کہ اسے قصائی کو بیچ کر پیسے کمائے جائیں۔ بچھڑا کسان کے کچھ ارادے بھانپ گیا لیکن اس دفعہ بھی وہ اصل حقیقت کا ادراک نہ کر سکا اور ویسے ہی اچھلتا کودتا رہا۔

پھر ایک دن قصائی اس کو لینے آ گیا۔ اجنبی کو دیکھ کر بچھڑا کچھ مزاحم ہوا لیکن پھر ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ قصائی نے اسے ایک باڑے میں باندھ دیا تاکہ باری آنے پر ذبح کیا جا سکے۔ یہاں پہنچ کر بھی اسے اپنی عاقبت کی حقیقت کا ادراک نہ ہوا اور وہ یوں ہی اچھلتا کودتا رہا۔

پھر بالآخر وہ دن آ گیا کہ قصائی اسے باڑے سے کھول کر ذبح خانے لے گیا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں بچھڑے سے مراد انسان کا نفس حیوانی ہے۔ جس کا تزکیہ اور ترقی انسانی زندگی کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسان اعلیٰ مذہبی اخلاقیات کو اپنائے، خدا سے تعلق قائم کرے، علم حاصل کرے اور وہ صفات اپنائے جس سے اسے اور اس سے متعلق لوگوں کو فائدہ حاصل ہو۔

موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کہا کہ وہ گائے ذبح کریں تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مختلف سوالات کیے کہ وہ گائے کیسی ہونی چاہئے۔ جس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ ایسی گائے ہے جس نے ہل وغیرہ نہیں چلایا یعنی مشقت نہیں کی ہے۔ نہ ہی اس نے کھیتوں کو پانی لگایا ہے۔ اس کو آپ ایک مست گائے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو وہ تو ہل چلانے کے لیے استعمال ہوئی ہے اور نہ ہی کھیتوں کو پانی دینے کے لیے استعمال ہوئی ہے—اس کو کبھی کوئی تنگی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ روحانی معنوں میں یہ ایک نفس کی کہانی ہے یعنی وہ گائے جس کو موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ذبح کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں وہ نفس کی گائے ہے جس کا تزکیہ نہیں ہوا، جس کے نفس نے کوئی ریاضت نہیں کی، کوئی مجاہدہ نہیں کیا۔ تگ و دو نہیں کی۔ حقائق و معارف کے حصول کے لیے کوئی سعی نہیں کی۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام ان

کو فرمارہے ہیں کہ اس گائے کو ذبح کریں۔یعنی اردو میں جیسے ہم کہتے ہیں کہ اس نفس کو ماریں اس نفس پہ قابو پائیں اور اس کی تکمیل کریں۔تاکہ ہم روحانی طور پر ترقی کریں۔

قرآن پاک میں ان آیات کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کذالک یحیی اللہ الموتی" کہ اللہ تعالی اسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا۔مردوں کو زندہ کرنے کا ایک مطلب انسان کا روحانی طور پر زندہ ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہمارے نفس کے اس بچھڑے کو ذبح کرنے کی یعنی اس کو کنڑول کرنے کی اور اس کو روح کے ماتحت کرنے کی توفیق عطا فرمائے تاکہ ہم روحانی طور پر زندہ ہوں ۔روحانی طور پر زندہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس میرٹ پر پورا اترے جس کی وجہ سے وہ جنت یعنی اعلی درجے کی زندگی کا حقدار ہوتا ہے۔

بادلوں کا سردار

متن حکایت۔

بادلوں کا گروہ ایک شہر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کے جلال سے پورے شہر پر کالی گھٹا چھا گئی۔ سردار نے بارش کو برسنے کا حکم دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش برسنا شروع ہو گئی۔ شہر کے درودیوار بارش سے دُھل گئے۔

بادلوں کا سردار اوپر سے دوربین لگائے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر جمع کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر پڑی۔ اس نے بارش کے قطروں سے کہا کہ اور زور سے برسو تا کہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر بہہ نکلیں اور گلیاں اور سڑکیں بھی صاف ہو جائیں۔ بارش کے قطروں نے پورا زور لگایا لیکن کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اپنی جگہ جمے رہے۔

یہ معاملہ دیکھ کر بادلوں کے سرادر نے قریبی دریا کے سردار کو خط لکھا کہ شہر میں لوگوں کی بد نظمی سے سڑکوں اور گلیوں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہیں، ہماری

بارش در و دیوار کو تو صاف کر سکتی ہے لیکن اتنے بڑے گند کے ڈھیروں کو دھکیلنا ہمارے بس میں نہیں۔

بادلوں کے سردار نے دریا کے سردار سے استدعا کی کہ ایک اونچے درجے کا سیلاب اس شہر کی طرف روانہ کیا جائے تا کہ صفائی ستھرائی کا اہتمام ہو سکے۔ دریا کے سردار نے ایک روز اپنے منہ زور پانیوں کا رخ اس شہر کی طرف موڑ دیا۔ پھر اس سیلاب میں بہنے والا صرف کوڑا کرکٹ ہی نہیں تھا بلکہ شہر کے مقیم بھی اس کی زد میں آ کے بہہ نکلے تھے۔

شرح حکایت۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورہ ملک میں فرمایا ہے۔

أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ۔

کیا تم آسمان والے سے امان میں آ گئے ہو کہ یہ زمین تمہیں دھنسا دے کہ جب یہ زمین حرکت میں آتی ہے۔

اس حکایت کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ کثافت کو لطافت پہ غالب نہیں آنا چاہیے۔ انسان کی روحانی منزل، لطافت کی منزل ہے اور روح جسم کے مقابلے میں لطیف تر ہے۔ کچھ ایسے عمال ہیں جو ہماری روح کو کثیف کرتے ہیں۔ جیسے شہر میں جب لوگوں نے ساتھ ساتھ صفائی نہیں کی تو گند جمع ہونا شروع ہو گیا۔ ایسے ہی اخلاقی اصولوں کو نہ اپنانے کی وجہ سے روح کے اوپر میل جمنی شروع ہو جاتی ہے اور تو پھر اس چیز کا اندیشہ ہوتا ہے کہ ہ کثافت لطافت پہ غالب آ جائے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بچے کے چہرے پر معصومیت ہوتی ہے اور اس کی باتوں میں بھی معصومیت جھلکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی تربیت اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر نہ ہوئی ہو تو جب

وہ بڑا ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کھردری ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ایک بالغ آدمی کے چہرے پہ وہ معصوم اثرات باقی نہیں رہتے۔ فطری معصومیت کے اوپر زمینی کثافت غالب آنا شروع ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی ہماری روح کے اندر لطافت ہے اور لطیف تر ہونے کی صلاحیت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی روح کی حفاظت کریں اور اس طرح کا تزکیہ کریں کہ ہم لطیف تر ہو جائیں اور جنت کی لطیف اور پاک زندگی میں رہنے کے قابل ہو جائیں۔

سادہ گائے

متن حکایت۔

ایک شخص نے گائے سے کہا، تم کیا سادہ مخلوق ہو۔ نری گائے کی گائے ہو، بدھو اور بے سمجھ۔ جدھر چاہے کوئی تمہیں ہانک کے لے جائے۔

گائے نے یہ سنا تو کہا تو نے میرے ظاہر کے ساتھ ہی کیوں معاملہ کیا، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ میں گھاس کھاتی ہوں اور میرے تھنوں سے نور کی طرح سفید دودھ نکلتا ہے۔
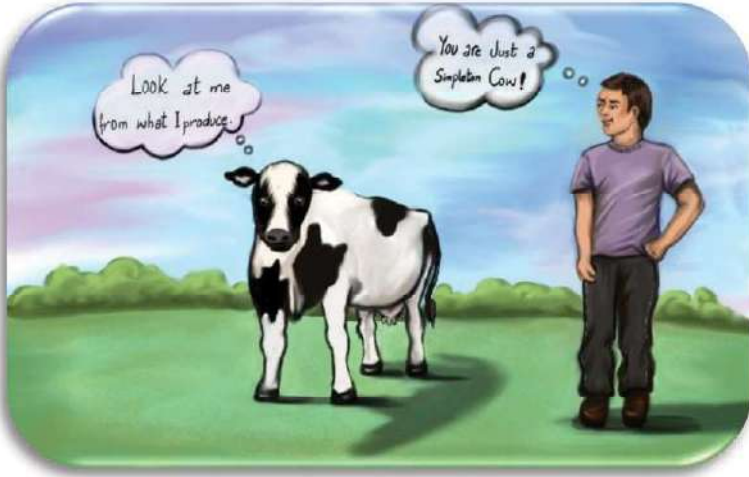
میرے اسی دودھ سے انسانوں کی نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔

یہ سن کر گائے کو کمتر سمجھنے والا شخص خاموش ہو گیا۔ گائے پھر بولی؛

یہ صرف میرے تک محدود نہیں کہ تم مجھے سادہ لوح ہونے کا طعنہ دے رہے ہو۔

ہر بڑا تخلیق کار جو تخلیق کے اعلی منصب پر فائز ہوتا ہے وہ اپنے ظاہری معاملے میں سادگی پر ہی ہوتا ہے۔

شرح حکایت۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

"عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے

عشق بیچارہ نہ زاہد ہے نہ ملا نہ حکیم "

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک دانشمند اور روحانی طور پر ترقی یافتہ آدمی عاجزی اور انکساری کا نمونہ ہوتا ہے اور وہ انسانوں کے ساتھ اپنے معاملات میں غیر ضروری طور پر چالاک نہیں ہوتا۔ اب دیکھیں گے کہ بڑے بڑے فلسفی، شاعر، پروفیسرز، سائنسدان اور روحانی اساتذہ بالعموم اپنے مزاج میں سادگی اور انکساری لیے ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کے مقابلے میں مادہ پرست اور دنیادار لوگ اپنے معاملات میں شوخیلے، چالاک اور عیار ہوتے ہیں۔

اوپر والے شعر میں عشق سے مراد اللہ تعالٰی کی ذات اور اس کی مخلوق کے ساتھ عشق ہے۔ محبت اور عشق بندے کو ایسی کیفیت میں لے جاتے ہیں جس میں وہ کائنات کے ساتھ موافقت میں ہو جاتا ہے۔ اب وہ نہ اپنے آپ کو زاہد بنا کر پیش کرتا ہے نہ ملا بنا کر اور نہ ہی کوئی فلسفی یا حکیم یا پیر بنا کر، بلکہ وہ ایک سادہ اور انکساری والا معاملہ کرتا ہے۔

اکثر لوگ جو سادگی اور انکساری والا معاملہ کر رہے ہوتے ہیں وہ اپنی ذات میں روحانی طور پر اور اللہ تعالٰی کے ہاں بڑے عالی درجوں کے مالک ہوتے ہیں۔

اللہ تعالی ہمیں لوگوں کے ساتھ معاملے میں سادگی اور انکساری اپنانے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ اس معاشرے میں غیر ضروری مقابلہ، طبقاتی دباؤ اور تقسیم کم سے کم ہو اور لوگ اپنی زندگیاں آسانی سے بسر کر سکیں۔

جنگلی بکری

متن حکایت۔

ایک بکری کے سینگ اوپر سے مڑ کر سامنے کی طرف بڑھنا شروع ہو گئے اور بڑھتے بڑھتے اتنے لمبے ہو گئے کہ دیکھنے والوں کو دو تیروں کی طرح محسوس ہوتے۔ چونکہ یہ آہستہ آہستہ بڑھے تھے اس لیے ان کی بڑھوتری کا اسے خود کوئی احساس نہیں تھا۔

جب وہ کسی دوسری بکری سے ملتی تو اس کے یہ سینگ سامنے والی بکری کے منہ پر جا کے لگتے اور وہ اسے بہت برا محسوس کرتی۔ آہستہ آہستہ دوسری بکریاں اس سے دور ہونا شروع ہو گئیں

ایک دوست بکری نے اس سمجھایا کہ تمہارے یہ بڑھے ہوئے سینگ دوسری بکریوں سے تعلق میں رکاوٹ بن گئے ہیں، جیسے بھی ہو تمہیں ان سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔

بالآخر جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو اس بکری نے ان سینگوں سے نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جنگل میں دو بیری کے درخت کے پاس آئی جس کے دو تنے تھے جن کے درمیان ہلکا سا فاصلہ تھا۔ بکری نے اپنے دونوں سینگ دو بیری کے ان دو تنوں کے درمیان پھنسائے اور زور سے جھٹکا دیا۔

ایک تڑاخ کی آواز آئی۔ سینگ ٹوٹ کر ایک طرف جا گرے اور بکری دوسری طرف۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ دو بیری کا درخت بھی ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔

بکری کچھ دیر کے لیے ہوش کھو بیٹھی لیکن چند لمحوں کے بعد اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس نے سینگھوں کے بغیر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب وہ آسانی کے ساتھ بغیر کسی تکلیف اور فاصلے کے دوسری بکریوں کے ساتھ ملتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ پھر سے سب کی منظور نظر ہو گئی۔

شرح حکایت۔

اس حکایت کا مرکزی استعارہ بکری کے آگے کی طرف بڑے ہوئے سینگ ہیں۔ آگے کی طرف بڑھے ہوئے سینگوں سے ہماری مراد انسان کی انا یا اس کی انا کا سفلی پہلو ہے جو نفس حیوانی کو طاقت دیتا ہے۔ مولانا رومؒ مثنوی میں فرماتے ہیں۔

"آئینہ ات دانی چرا غماز نیست

زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست"

تو جانتا ہے تیرا آئینہ غماز کیوں نہیں ہے اس لیے کہ زنگ اس کے چہرے سے علیحدہ نہیں ہے۔ تجھے اس آئینے میں اپنی تصویر کیوں دکھائی نہیں دیتی، اس لیے کہ اس پر زنگ چڑھا ہوا ہے، اگر یہ زنگ اس کے اوپر سے ہٹ جائے تو پھر اس میں تمھیں اپنی تصویر نظر آئیگی۔ یہ جو آئینے کے اوپر زنگ ہے اس کو حیوانی انا کہتے ہیں۔ یہ جو پوری

کائنات کا وجود ہے یہ ایک سمندر کی طرح ہے۔ایک انسان کو اپنے انفرادی شعور کو اس کائنات کے ساتھ موافقت میں لانا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذاتی شعور کے ساتھ انا کا بوجھ کم سے کم ہو۔اگر اس کی انا نے غیر ضروری کل پرزے نکالے ہونگے تو ایسے میں وہ ثقیل اور کثیف ہونے کی وجہ سے حقائق کے سمندر میں تیرنے کے قابل نہیں ہو گی۔

رسول پاک ﷺ کی حدیث کا مفہوم ہے کہ جس کے دل میں ذرا بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ تکبر اس کی انا کا حصہ بن کر مزاحمت کا کردار ادا کرے گا—اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے نفوس کا تزکیہ کریں اور نفس مطمئنہ یا قلب سلیم کے درجے پر پہنچنے کی کوشش کریں تا کہ ہم اپنی اس زندگی میں اور اگلی زندگی میں راحت اور سکون کے ساتھ رہ سکیں۔

اللہ ہمیں اپنی انا کے تمام چھوٹے بڑے سینگوں سے نجات دے۔

پتنگ اور پرندہ

متنِ حکایت۔

ایک پتنگ آسمان کی بلندیوں میں اُڑ رہی تھی۔اس دوران اس کی ملاقات ایک پرندے سے ہوئی۔ پتنگ خوبصورت تھی اور وہ پرندہ بھی خوبصورت تھا، دونوں میں دوستی ہو گئی۔

ایک دن پرندے کی نظر اس ڈور پہ پڑی جس سے پتنگ بندھی ہوئی تھی۔پرندے نے کہا یہ ڈور کیا ہے۔پتنگ نے کہا یہ وہ ڈور ہے جس سے میں بندھی ہوئی ہوں اور اسی ڈور سے زمین سے میری پرواز کنڑول کی جاتی ہے۔
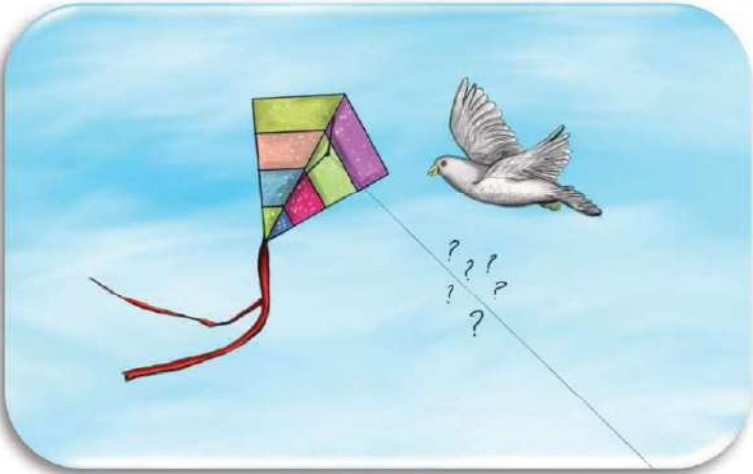
یہ سن کر وہ آزاد پرندہ حیران رہ گیا۔اس نے پتنگ سے کہا، اپنے زمینی کنڑول کے ساتھ تم کبھی بھی میرے ساتھ دوستی نہیں نبھا سکتی۔ میں ایک آزاد پرندہ ہوں۔ آسمان کی وسعتوں میں یہ جا، وہ جا۔اور تم ایک ڈور سے بندھی مجبور پتنگ۔

اسی اثناء میں کسی نے زمین سے ڈور کھینچی، پتنگ یکدم نیچے کی طرف لڑک گئی، پرندے نے یہ دیکھا تو اڑان بھر کر مزید بلند ہو گیا۔

شرح حکایت۔

یہ ایک خوبصورت اور نازک حکایت ہے۔ پرندہ سے ہماری مراد روح کا پرندہ ہے اور پتنگ سے ہماری مراد جسم کا پتنگ ہے۔

روح کا پرندہ بلند پرواز کا متمنی ہے اور جسم کی پتنگ کی وفا زمین اور دنیا کے ساتھ ہے۔ پتنگ اپنی وفا کے دھاگے کے ساتھ بندھی ہے اور اس کا کنٹرول نیچے زمین پہ ہے—یہ زمینی زندگی ایک نچلے لیول کی زندگی ہے۔ اسی کائنات میں ہماری سوچ سے بالاتر مزید انتہائی خوبصورت زندگیاں موجود ہیں جنہیں ہم جنت کہتے ہیں۔ دنیا کا لفظ ادنی سے تو یہ ایک ادنی زندگی ہے-اس ادنی سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اسے اس کے ذاتی مفہوم میں گھٹیا سمجھتے ہیں بلکہ یہ اپنے کمپیریٹو مفہوم میں ادنی ہے۔ یعنی جب ہم اس کا مقارنہ اگلی جنت کی زندگی سے کرتے ہیں تو پھر اپنی کوالٹی کے لحاظ سے یہ ادنٰی زندگی ہے جس کا اس آخرت سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔

روح کی بلند پروازی سے مراد انسان کا اعلیٰ اخلاقی وجود کا حامل ہونا ہے۔ اگر انسان اخلاق رزیلہ کے ساتھ مرتا ہے تو پھر لالچ، خود غرضی، فحاشی، حسد، بدیانتی جیسے اعمال اس کے نفس میں گھر کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی روح اس میرٹ پر پورا نہیں اترتی جو میرٹ اعلیٰ جنتوں کے باسی بننے کے لیے درکار ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے حیوانی نفس کا تزکیہ کرے اور اپنی غیر ضروری اٹیچمنٹ کے دھاگے کاٹے- اگر وہ جسمانی خواہشات اور شہوات کا طالب ہو گا تو زمین

کے ساتھ اٹیچ ہوگا اور یہ پتنگ جب زمین کے ساتھ اٹیچ ہوگی تو یہ اس طرح کی پرواز نہیں کر سکتی جیسا کہ وہ پرندہ کر سکتا ہے جو آزاد ہو۔

گرم مصالحہ

متن حکایت۔

ایک شاہی باورچی چھٹی پر اپنے گاؤں آیا۔ اس نے اپنے ساتھ کچھ مقدار میں شاہی گرم مصالحہ بھی لے لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس شاہی گرم مصالحے سے جو بیسیوں اجزاء کو ملا کر بنایا گیا تھا کوئی خاص مزیدار کھانا تیار کر کے گاؤں میں رشتہ داروں کو حیران کر دے گا۔

چنانچہ اس نے ایک دن شاہی قورمہ تیار کیا جس میں شاہی مصالحہ استعمال کیا۔ اس نے باری باری یہ قورمہ اپنے رشتہ داروں کو پیش کیا۔

اسے یہ جان کر بہت مایوسی ہوئی کہ کچھ لوگوں کو اس شاہی مصالحہ کا ذائقہ بالکل بھی پسند نہ آیا اور کچھ بس یوں ہی خاموش رہے۔ کچھ تو یہاں تک کہہ گئے کہ اس سے ان کا عام نمک مرچ والا سالن زیادہ ذائقے دار ہوتا ہے۔

اصل میں ان لوگوں میں اس شاہی گرم مصالحے کی خوشبو اور ذائقے کو محسوس کرنے کی حس ہی موجود نہ تھی۔

شرح حکایت۔

گرم مصالحہ میں مختلف سپائسز ہوتے ہیں جب انسان اس کو ٹیسٹ کرتا ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے۔ جس طرح گرم مصالحہ کھانے کو ذائقہ دیتا ہے ایسے ہی اس دنیا میں انسان کے خدا کے تعلق کے حوالے سے کچھ ایسے لطیف ذوق اور معارف موجود ہیں جو اہل ذوق کو مزا دیتے ہیں—

البتہ کچھ لوگ مختلف وجوہات کی بنیاد پر اس طرح کے ذوق سے محروم ہوتے ہیں اور وہ ان لطیف معارف اور لطیف ذوق کا انکار کر دیتے ہیں۔اس حکایت میں اصل میں ہم یہ یاد دہانی کروانا چاہتے ہیں کہ جو لوگ لطیف ذوق اور لطیف حس نہیں رکھتے ان کو اس لطیف ذوق اور لطیف حس کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

"اسی کشمکش میں گزری میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی"

یعنی میری زندگی کی راتیں اسی اضطراب میں اسی کشمکش میں گزری ہیں کہ کبھی تو مجھے رومی کا سوز و ساز حاصل ہوتا ہے، میں رومی کی عرفانی شاعری میں لذت محسوس کرتا ہوں اور معرفت میں بلند ہوتا ہوں اور کبھی رازی کے پیچ و تاب یعنی کلامیانہ ذوق سے بہرہ مند ہوتا ہوں۔

مولانا روم فرماتے ہیں۔

" فلسفی کو منکر حنانہ است

از حواس اولیاء بیگانہ است"

مشہور واقعہ ہے نبی پاک ﷺ مسجد نبوی میں لکڑی کے ستون کے ساتھ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے بعد میں جب صحابہ کرام نے ممبر تیار کروایا اور نبی پاک ﷺ نے اس ستون سے ہٹ کر ممبر پر خطبہ دیا تو اس لکڑی کے تنے سے رونے کی آواز آئی، اس آواز کو صحابہ کرام نے بھی سنا۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ فلسفی حنانہ کا انکاری ہے وہ کہتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تنے سے رونے کی آواز آنی شروع ہو جائے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ایسا کیوں ہے، اس لیے کہ فلسفی اولیاء کے حواس سے بیگانہ ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ ان پانچ حواس کے علاوہ کچھ اور لطیف روحانی حواس بھی ہوتے ہیں جو انبیاء اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اولیاء کو حاصل ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

"بو علی اندر غبار ناقہ گم

دست رومی پردہ محمل گرفت"

بو علی سے مراد بو علی سینا ہے جو کہ فلسفی تھے اور بڑی اعلیٰ شخصیت تھے لیکن اُن کا طرز استدلال فلسفیانہ تھا۔ جب اونٹنی ریگستان میں جارہی ہوتی ہے تو اونٹنی کے پاؤں سے دھول اٹھتی ہے غبار پیدا ہوتا ہے۔ اونٹنی کے اوپر کجاوہ ہے اور کجاوے کے اندر دلہن بیٹھی ہے، جبکہ کجاوے پہ مخمل کے پردے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ بو علی سینا، اونٹنی کے چلنے سے جو غبار جمع ہوا ہے اس کے اندر گم ہو گئے ہیں جبکہ پیر رومی جو لطیف ذوق اور لطیف حواس کے حامل ہیں ان پر اس دھول کا اثر نہیں ہے بلکہ انہوں نے آگے بڑھ کر کجاوے کے پردے کو پکڑ لیا ہے۔ یعنی وہ وصل کے مقام پر پہنچ گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں لطیف ذوق اور لطیف حواس عطا فرمائے تاکہ ہماری روح آگے بڑھ کر کائنات کے لطیف رموز کو سمجھنے والی بنے۔

پیزا

متن حکایت۔

ایک عورت اپنے بچوں کے لیے شوق سے کھانا تیار کرتی تھی لیکن صفائی پسند نہیں تھی۔ اکثر برتن اور کھانے کی چیزیں کھلی پڑی رہتیں اور رات کو ان چیزوں پر کیڑوں مکوڑوں کا گزر ہوتا جس سے ان میں جراثیم پیدا ہو جاتے۔

ایک دن اس عورت نے بچوں کے لیے پیزا بنانا شروع کیا۔ اس نے سبزیاں اور چکن رات سے ہی تیار کیے ہوئے تھے لیکن ان کو ڈھانپا نہیں تھا۔ رات کو ایک چھپکلی چکن میں گھومتی رہی، صبح کو وہی چکن اسنے بغیر دھوئے پیزے میں استعمال کیا۔ پیزا جب تیار ہوا تو دکھنے میں بہت شاندار تھا لیکن اپنے مزاج میں زہریلہ تھا۔

بچے انتظار کر رہے تھے۔ وہ گرم گرم پیزا کھانے کی میز پر لائی اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر تناول کیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پورے گھر کو الٹیاں لگ گئیں اور چکر آنے

لگے۔پڑوسیوں نے سب کو جلدی میں ہسپتال پہنچایا۔ڈاکٹروں نے بڑی مشکل سے ان کی جان بچائی۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح اس عورت نے پیزا بناتے وقت صفائی ستھرائی کا خیال نہیں رکھا اور اس کے ناقص عمل کی وجہ سے جب پیزا تیار ہوا تو اس کے بچے وہ پیزا کھا کر بیمار ہو گئے۔ایسے ہی والدین کے باقی اعمال بھی ان کے بچوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس لیے والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے روزمرہ کے معاملات اپنے خیالات اور اپنے رزق کے حصول کے ذرائع کو پاکیزہ رکھیں تاکہ ان کے پاکیزہ اعمال سے نہ صرف ان کی اپنی ارواح کا تزکیہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی اولاد پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوں۔ اگر والدین نیک ہوں گے تو کائنات کی وہ قوتیں جو نیکی کو سپورٹ کرتی ہیں وہ ان کے بچوں کی زندگی کے معاملات میں معاونت کریں گی، دوسری صورت میں والدین کے ناقص اعمال کے اثرات سے ان کے بچے کائنات کی منفی قوتوں کی زد میں آجائیں گے۔

سورۃ کھف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔جب وہ اس سفر کے دوران ایک گاؤں میں پہنچتے ہیں تو اس گاؤں کے لوگ اگرچہ ان کی میزبانی نہیں کرتے لیکن پھر بھی حضرت خضر علیہ السلام وہاں پر ایک دیوار جو گر رہی ہوتی ہے اس کی تعمیر کر دیتے ہیں۔بعد میں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے سوال کرتے ہیں کہ آپ نے اس دیوار کو کیوں تعمیر کیا تو وہاں پر حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔

کہ وہ دیوار اس شہر میں دو یتیم بچوں کی تھی اور اس دیوار کے نیچے ان کے لیے ایک خزانہ تھا۔ان کا والد ایک نیک آدمی تھا تو آپ کے رب نے چاہا کہ وہ بچے بڑی عمر کو پہنچ جائیں، سمجھدار ہو جائیں تو وہ اپنا خزانہ دیوار کے نیچے سے نکال لیں۔اور یہ آپ کے رب کی رحمت ہے۔یعنی ان کے والد کے صالح ہونے کے نتیجے میں حضرت خضر علیہ السلام کی غیبی مدد ان بچوں کو حاصل ہوئی۔

جس طرح نیک اعمال نیکی کی طاقتوں کو متوجہ کرتے ہیں ایسے ہی برے اعمال شیطانی طاقتوں کو متوجہ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہم اپنے متعلقہ لوگوں کے لیے بھی رحمت ، برکت اور نیکی کی طاقتوں کی معاونت حاصل کرنے کا باعث بنیں۔

سرچ انجن

متن حکایت۔

ایک طالب علم نے سرچ انجن پہ جا کر بحر اوقیانوس تلاش کرنا چاہا۔اس نے پہلے "ب" ٹائپ کیا۔ "ب" ٹائپ کرنے پر سرچ کے اہداف بہت وسیع تھے اس لیے اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔

پھر اس نے "ح" ٹائپ کیا۔ابھی بھی مطلوبہ ہدف حاصل نہ ہوا۔اس نے "ر" ٹائپ
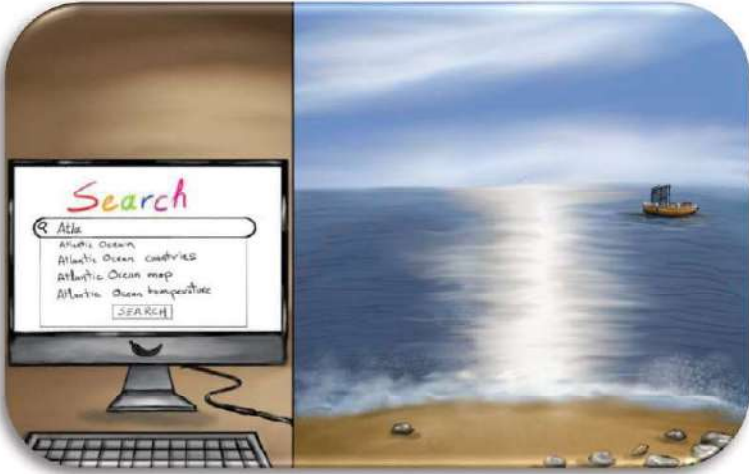
کیا تو اس کے سامنے کئی قسم کے "بحر" آ گئے۔پھر اس نے اس میں سے "بحر اوقیانوس" کا پیج نکالا۔یوں بحر اوقیانوس کے بارے میں سب معلومات اس کے سامنے پڑی تھیں۔

لیکن یہ سب ابھی بحر اوقیانوس کے بارے میں صرف معلومات کی حد تک ہی علم تھا۔ اصلی بحر اوقیانوس اس معلومات کے علاوہ ایک وجود رکھتا تھا اور اس بحر اوقیانوس کی

وسعتوں کو پالینااوران گہرائیوں میں اتر کراس کے اندر موجود خزانوں تک پہنچناایک عملی جدوجہد کامتقاضی تھا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خدا کی تلاش یا حقیقت کی تلاش ایک تدریجی عمل ہے یعنی انسان آہستہ آہستہ اچھے اعمال کے ذریعے خدا کے قریب ہوتا ہے۔ یہ ایسا عمل نہیں ہے جوانسان کوایک دم حاصل ہوتا۔

جب آدمی مسلسل عمل، حصول معرفت کی طلب، ریاضت اور مجاہدے سے گزرتا ہے تو رفتہ رفتہ خدا کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ استقامت اور مدادمت بالآخر انسان کواس کی منزل مقصود تک پہنچادیتی ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں۔

"اتصالے بےتکیف بے قیاس

ہست رب الناس راباجان ناس"

کہ لوگوں کوخدا کے ساتھ ایک اتصال حاصل ہوتا ہے لیکن وہ اتصال بےتکیف اور بے قیاس ہوتا یعنی اس وہ تعلق نہ توپوری طرح قیاس کیاجاسکتااورنہ اس تعلق کی کیفیت کو پوری طرح بیان کیاجاسکتا ہے۔ لیکن بہر حال انسان کااپنے رب کے ساتھ ایک تعلق ضرور قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

جو لوگ ہمارے رستے میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان کو اپنے راستوں کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ یعنی انسان جب کوشش کرتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکو ایسے راستے دکھاتا ہے جن پر چل کر وہ اس کائنات کے حقائق اور اللہ تعالیٰ کی قربت کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اس حکایت میں ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اس تلاش میں آگے بڑھتا ہے پہلی تلاش کے بعد وہ کچھ قریب ہوتا ہے پھر اگلی تلاش کے بعد وہ اور قریب ہوتا ہے۔ اس طرح وہ قریب سے قریب تر ہو جاتا ہے لیکن انسان کی یہ طلب اور کیفیت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ جیسے علامہ اقبالؒ نے فرمایا۔

"کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبیں نیاز میں"

کہ اے وہ منتظر حقیقت جس کا میں ہر وقت انتظار کرتا رہتا ہوں۔ تو مجھے کبھی مجازی لباس میں نظر آ یعنی تو کبھی ظاہر میں بھی آ۔ کہ میری نیاز مندی کی جبیں، نیاز مندی کے ماتھے میں ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں مشتاق ہوں۔ انسان ہمیشہ سے مشتاق رہتا ہے اس کے اندر اشتیاق رہتا ہے اپنے رب سے ملنے کا۔ اصل میں یہ تڑپ، طلب اور جستجو ہی ہے جو انسان کو دن بدن خدا سے قریب کرتی جاتی ہے۔ خدا کی قربت اس کی روح کو قوی تر کرتی ہے اور روح کا قوی تر ہونا ہی آئندہ آنے والی زندگی میں انسان کو فائدہ دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں خدا کی تلاش کے سفر میں استقامت اور مداومت عطا فرمائے۔

کالے انڈے

متن حکایت۔

ایک مرغی چھپ کر کوئلے کی بوری میں انڈا دیتی رہی۔ گھر والے متلاشی رہتے کہ آیا یہ مرغی کہاں انڈا دے کر آتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کو پتہ چلا کہ کوئلوں کی بوری میں درجن بھر انڈے پڑے ہیں۔ کوئلوں میں رہنے کی وجہ سے انڈے بھی کالے رنگ میں رنگ گئے تھے۔

گھر کی مالکن نے انڈوں کو ایسا ہی اٹھا کر مرغی کے نیچے سینے کے لیے رکھ دیا۔ مالکن کو

کچھ دن بعد فکر لگی کہ انڈے تو اوپر سے کالے ہو گئے تھے ایسا نہ ہو کہ ان کے اندر سے بچے بھی کالے نکلیں۔ وہ فکر مند اور متجسس تھی۔ تاہم مقررہ وقت پر انڈوں سے انتہائی حسین ورنگ برنگ چوزے نکلے جنہیں دیکھ کر گھر کی مالکن خوش ہو گئی۔ باہر کی کالک نے ان کے پیدائشی حسن پر کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔

شرح حکایت۔

دنیا میں انسان کی ظاہری حالت کو ہم انسان کے باطن کے ساتھ اس طرح قیاس نہیں کر سکتے کہ ہم اس سے یہ نتیجہ نکالیں کہ چونکہ انسان کا ظاہر مشقت اور محنت کی وجہ سے یا حالات کی سنگینی کی وجہ سے اگر زیادہ رنگین نظر نہیں آرہا تو اس کی باطنی حالت بھی زیادہ پر کشش نہیں ہو گی۔

مولانا روم فرماتے ہیں۔

"ہر کہ او بیدار تر، پُر درد تر

ہر کہ او آگاہ تر رخ زرد تر"

کہ جو جتنا زیادہ بیدار ہے اتنا ہی زیادہ پر درد ہے یعنی بیداری اس کے اندر درد پیدا کرتی ہے۔ اور جو کوئی جتنا زیادہ آگاہ ہے اتنا ہی زیادہ اس کا چہرہ زرد ہے۔ روحانی طور پر بیدار اور آگاہ ہونا انسان کے درد میں اضافہ کرتا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کو بعد میں آنے والی زندگی کے حالات سے آگاہی نہیں، آنے والے دنوں کی خبر نہیں، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایک باہوش ذمہ دار آدمی کے مقابلے میں زیادہ خوش نظر آئے۔ کیونکہ غفلت اور لا پرواہی بھی ایک طرح سے ظاہری خوشی کا باعث بنتی ہے۔ لیکن ایک روحانی طور پر بیدار آدمی زیادہ پر درد ہوتا ہے اور اس کا چہرہ زیادہ پیلا ہوتا ہے، کیونکہ اس کو اس کائنات کے حقائق سے اور آنے والی زندگی کے معاملات سے آگاہی ہے۔ چونکہ وہ چیلنجز کو پہلے سے دیکھتا ہے اس لیے یہ چیلنجز اس کی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

"نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی عقیدت ہو تو دیکھ ان

ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں"

تو یہاں علامہ اقبالؒ بنیادی طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تم کسی درویش یا فقیر کی ظاہری حالت پہ نہ جاؤ۔ اگر تمہیں ادراک ہو تو تم دیکھو کہ ان کے آستینوں میں ید بیضا ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

"جوز ہا بشکست وآن کان مغز داشت

بعد کشتن روح پاک نغز داشت"

اخروٹ کو جب توڑا جاتا ہے اور جس کے اندر اچھا مغز ہوتا ہے۔ تو اس کے اندر گویا اچھی پاک روح ہوتی ہے۔ ہم اخروٹ کی قیمت کا اس کی ظاہری حالت سے موازنہ نہیں کر سکتے کیوں باہر سے تو وہ بھدا اور کھردرا سا معلوم ہوتا ہے۔ اس اخروٹ کو توڑا جائے اگر توڑنے کے بعد اس کی گری صحتمند برآمد ہوتی ہے تو ایک اچھا اخروٹ ہے۔ ایسا ہی انسان کا معاملہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اندر سے برآمد ہونے والی روح کی کوالٹی سے وابستہ ہے۔ اگر اس کی روح اچھی کوالٹی کی ہے تو وہ ایک اچھا انسان ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر طرح کے حالات میں ہمیں ہماری ارواح کو مضبوط رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

متن حکایت۔

ایک شخص نے گھاس پہ پاؤں رکھا اور کہا تیرا مقام میرے پاؤں کے نیچے ہے۔

گھاس نے جواب دیا، ایسا بالکل نہیں، میرا مقام زمین کے خوبصورت سر پر ہے۔ تیرا یہ پیر ایک عارضی تکلیف ہے جو بہت جلد گزر جائے گی اور جب تک میرا رشتہ زمین کے سر سے قائم ہے مجھے ان تکلیفوں سے کوئی نقصان پہنچنے والا نہیں۔

شرح حکایت۔

زمین رحم مادر کی طرح ہے جو ہر چیز کی پرورش کرتی ہے۔ زمین سے منسلک رہنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اس کائنات کے اصولی حقائق کے ساتھ منسلک رہے۔

اگرانسان اس کائنات کے اصولی حقائق کے ساتھ منسلک رہے گا تو اس کے بعد اس کے اوپر جو حالات آئیں گے، جو مشکلات آئیں گی وہ اصولی حقائق سے حاصل ہونے والے فائدے کے مقابلے میں بہت معمولی ہونگی۔ انسان اس زمین اور کائنات کے اصولی حقائق کے ساتھ منسلک رہنے کی وجہ سے بہتر طریقے سے پرورش، نشوونما اور ترقی پائے گا۔

اگرانسان رحم، شفقت، سخاوت اور دیانت کے بنیادی اصولوں پر کھڑا ہے تو انسان کے اس اخلاقی رویے کی وجہ سے یہ زمین اور اس کائنات کا اصولی نظام اسے ایسے ہی بدلہ دے گا۔یعنی اس کو اس کی مہربانی، شفقت، سخاوت اور دیانت کے جواب میں اسی مہربانی، شفقت، سخاوت اور دیانت کا سامنا کرنا پڑے گا، جو اس کی زندگی کو آسان سے آسان تر بنائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں زمینی اور آسمانی حقائق کے ساتھ منسلک اور مرتبط رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

متن حکایت۔

چھٹی والے دن وہ بچوں کو لے کر قریبی پارک میں آیا۔ وہ خود گھاس پر بیٹھ گیا جبکہ بچے پاس ہی لگے جھولوں پہ کھیلنے لگے۔

اس کی نظر اچانک ایک سلائیڈ پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ بچے ایک طرف سے سلائیڈ پر چڑھتے ہیں اور گھسٹ کر دوسری طرف آ جاتے ہیں اور پھر یہی عمل ایک ہی طریقے پر بار بار کرتے چلے جاتے ہیں۔

پھر اس کا خیال اپنی جانب مڑا۔ اس نے سوچا کہ بلکل بچوں کے سلائیڈ پر چڑھنے اور گھسٹ کر نیچے اترنے کی طرح وہ سالہا سال سے دفتر جاتا اور گھر واپس آتا ہے اور یہی عمل مسلسل کرتے جا رہا ہے۔ اسے لگا کہ اس نے اپنی عمر کا ایک طویل دورانیہ یونہی کسی بڑے مقصد کے بغیر گزار دیا ہے۔

اس کی نظر پھر جھولوں کی طرف گئی۔اس نے دیکھا کہ سلائیڈ کے علاوہ اور بھی کئی طرح کے جھولے ہیں جو مختلف شکلوں میں گھومتے ہیں۔اس احساس ہو کہ بچوں کے جھولوں میں تو بہر حال ورائٹی تھے لیکن اس نے ایک طویل عمر ایک ہی قسم کا جھولا جھولتے گزار دی۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زندگی ایک عبث روٹین کا نام نہیں ہے کہ وہ بس کسی ایک لگی بندھی روٹین میں بسر کی جائے۔انسان اپنی علمی اور روحانی ترقی کے لیے کوئی سامان نہ کرے اور اس کا ٹائم ختم ہو جائے۔بلکہ انسان کو اپنے مقصد حیات کا تعین کرنا چاہے اور پھر اس زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس متعین مقصد کو پالینے کی جستجو بھی کرنی چاہیے۔

روز مرہ کی روٹین جس میں اس نے کھانے پینے کے اسباب پیدا کرنے ہوتے ہیں اگر وہی روٹین انسان کی ساری زندگی کو کھا جائے تو یہ انسان کے لیے ناکامی کا سبب ہے۔ ایک مثالی انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے نظام کو سمجھتا ہے اور اس کائنات کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا ہے اور جس طرح یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے انسان بھی اس کائنات کے تسلسل کے ساتھ مسلسل پھیلنا چاہتا ہے اور ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اکبر الہ آبادیؒ فرماتے ہیں۔

"ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن لی پھر مر گئے"

یعنی یہ تو کوئی بڑا مقصد نہیں کہ دنیا میں بندہ آیا۔اس نے بی اے کیا، نوکر ہوا، پنشن لی اور پھر مر گیا۔یہ ایک روٹین کی لائف ہے۔اس روٹین کی لائف سے باہر آنا چاہیئے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب اسرار خودی کے شروع میں نظیر نیشاپوری کا ایک شعر لکھا ہے۔

"نیست در خشک و تر بیشہ من کوتاہی
چوب ہر نخل کہ ممبر نہ نشود دار کنم"

کہ میرے جنگل کی خشک و تر کسی لکڑی میں کوئی کوتاہی نہیں ہے یعنی میرے جنگل کی خشک یا تر لکڑیوں میں کوئی بے کار نہیں ہے۔جس لکڑی سے ممبر نہیں بن سکتا میں اس سے تختہ دار بنا لیتا ہوں ۔مطلب یہ کہ میں زندگی کی تمام ممکنات کو بروئے کار لاتا ہوں۔

انسان کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تمام تر استعداد بروئے کار لائے۔ برگد ایک بڑا درخت ہوتا ہے لیکن اگر اس کے بیج کے اندر موجود پوٹینشل کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے بیج کو ایک چڑیا ہی کھا کے ختم کر دیتی ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ فرماتے ہیں۔

"زندگی جہد است و استحقاق نیست
جزبہ علم انفس و افاق نیست"

فرماتے ہیں کہ زندگی جہد سے عبارت ہے۔ کوشش سے عبارت ہے یہ کوئی استحقاق نہیں کہ جو آدمی دنیا میں آیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جائے گا، بلکہ یہ جہد اور کوشش سے عبارت ہے۔جب تک نفس اور آفاق کا علم حاصل نہ کیا جائے تب تک یہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی—انفس کا علم کیا ہے—۔یہ اس چیز کا علم ہے کہ انسان کہاں

سے آیا ہے اور کہاں جارہا ہے۔اس کائنات میں نیکی اور بدی کی کونسی طاقتیں موجود ہیں اس سارے علم کو ہم انفس کا علم کہہ سکتے ہیں۔

اور آفاق سے مراد پوری کائنات ہے۔یہ پوری کائنات کیسے چل رہی ہے۔سورج، چاند ستارے کیا ہیں اور اس کائنات کا کون پیدا کرنے والا ہے یہ سارا آفاق کا علم ہے۔

جب تک انفس اور آفاق کا علم حاصل نہ کیا جائے تب تک یہ زندگی اس نہج پہ نہیں پہنچتی جس کو ہم اخروی طور پر کامیاب زندگی کہہ سکتے ہیں۔

فٹ بال

متن حکایت۔

کچھ ایلینز (Aliens) ایک اڑن طشتری پر زمین کے بہت قریب آ گئے۔ زمین سے کچھ فاصلے پر فضا سے انہیں ایک فٹ بال کی گراؤنڈ نظر آئی جس پہ ایک فٹ بال میچ ہو رہا تھا۔

وہ نیچے آنے پہ متذبذب تھے اس لیے انہوں نے اوپر سے ہی فٹ بال میچ دیکھنا شروع

کر دیا۔ کیونکہ ان کے سیارے میں ایسی کوئی گیم نہیں تھی اس لیے وہ سمجھے کہ شاید کچھ لوگ کسی گول سی چیز کے لیے لڑ رہے ہیں۔ پھر اچانک بال گول پوسٹ میں چلی گئی۔ وہ سمجھے کہ شاید اب یہ لڑائی ختم ہو گئی ہے لیکن گیند کو پھر میدان میں لایا گیا۔ اور پھر یہ کھیل شروع ہو گیا۔

انہوں نے اڑن طشتری زمین کے قریب لاتے ہوئے ایک کھلاڑی کو اُچکا اور اڑن طشتری فضا میں بلند کر دی۔اس اغواہ سے ان کا مقصد اس ساری کشمکش کو سمجھنا تھا۔

انہوں نے اس کھلاڑی سے پوچھا کہ آپ سب اس بال پر کیوں لڑ رہے ہیں اور اس میں آپ لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ کھلاڑی نے انہیں بتایا کہ ہمارا مقصد بس بال کو گول پوسٹ میں لے جانا ہی ہے اور اس کے بعد بال کو دوبارہ سنٹر میں لا کر پھر کھیل شروع کر دیا جاتا ہے حتیٰ کہ کھیل کا وقت ختم ہو جائے اور وقت ختم ہونے پر کھیل ختم ہی تصور ہوتا ہے چاہے بال میدان میں کسی بھی جگہ واقع ہو۔ایلینز یہ سن کر بڑے متعجب ہوئے۔ان کے لیے یہ بڑی ہی اچنبے کی بات تھی کہ زمین کے لوگ ایک فضول مشق میں لگے ہوئے تھے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ زندگی محض کھیل کود کے لیے نہیں۔ صرف ایسی سر گرمیوں کے لیے نہیں جو سر گرمیاں آخر کار حیاتیاتی موت کے بعد انسان کو کچھ فائدہ نہ دے سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ

(سورۃ المومنون آیۃ 115)

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں ایسا ہی پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔ تم نے ہماری طرف لوٹ کر نہیں آنا۔یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو تنبیہ کرتا ہے کہ تمہاری یہ تخلیق، تمہیں پیدا کرنا ایک عالی مقصد کے لیے ہے۔ تم دنیا میں فضول کھیل تماشے کے لیے نہیں آئے بلکہ دنیا کی زندگی تمہارے لیے ایک آزمائش ہے ایک

امتحان ہے۔ جیسے حدیث میں آتا ہے۔ الدنیا مزرعۃ الاخرۃ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی یہاں پر آپ فصل کاشت کروگے اور آخرت میں کاٹو گے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (سورۃ العنکبوت آیت نمبر 64)

یعنی اس دنیا کی زندگی لہو و لہب کی طرح ہے یعنی یہ حقیقی زندگی نہیں۔ وہ جو آخرت کی زندگی ہے وہ ہمیشہ کی زندگی ہے اس زندگی کے اندر زندگی پائی جاتی ہے۔ اس زندگی کو دوام حاصل ہے۔ جب انسان روزمرہ کے امور پر بھی غور کرے تو سمجھ سکتا ہے کہ یہ دنیا ایک فانی دنیا ہے ، عارضی دنیا ہے ۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی با مقصد بنائے۔ آخرت کی زندگی ایک مضبوط اور مستقل زندگی ہے اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس دنیا کی زندگی کے اس پہلو سے جو صرف لہو لعب سے متعلق ہے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں مقصدیت کی طرف راغب کرے تا کہ ہم اگلی مستقل زندگی کی طرف بڑھ سکیں۔

جنگلی گائے

متن حکایت۔

کسی کسان کی گائے چراگاہ سے شام کو واپس گھر نہ پہنچی۔ گائے چرتے چرتے دور جنگل میں چلی گئی اور گھر واپس آنے کا رستہ بھول گئی۔ اگلی صبح اس کی ملاقات اپنی ایک ہم جنس جنگلی گائے سے ہوئی۔ جنگلی گائے نے دیکھا کہ وہ گھبرائی ہوئی ہے۔

اس نے اس گھریلو گائے سے گھبراہٹ کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا کہ وہ اپنے گھر کا راستہ بھول گئی ہے اور اس کا مالک اس کا انتظار کرتا ہوگا۔ جنگلی گائے یہ سن کر حیران ہوئی۔ اس نے کہا کیسا گھر اور کون سا مالک۔ ہم جنگلی گائیوں کا نہ تو کوئی گھر ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مالک۔ جدھر چاہیں آزادی سے گھومتی پھرتی ہیں۔ پھر جنگلی گائے کی نظر اس کے گلے میں بندھی رسی پر پڑی۔ اس نے کہا یہ کیا ہے۔ گھریلو گائے نے کہا اس رسی سے میرا مالک مجھے کلّے کے ساتھ باندھ دیتا ہے۔ یہ سن کر جنگلی گائے نے کہا جب تیرا مالک اتنا ظالم ہے تو پھر تو اس کے پاس جانے کے لیے اتنی بے چین کیوں ہے۔

گھریلو گائے نے جواب دیا کہ وہ مجھے چارہ بھی ڈالتا ہے اور میرا دودھ بھی دوہتا ہے۔ جنگلی گائے نے کہا چارے سے تو پورا جنگل بھرا پڑا ہے پھر تجھے اس کے ہی چارے کی حرس کیوں ہے۔اور وہ تیرا دودھ کیوں دوہتا ہے، یہ تو تمہارے اپنے بچھڑے کا حق ہے۔گھریلو گائے نے جواب دیا کہ اس نے میرے بچھڑے کو الگ باندھ دیا ہے تا کہ وہ دودھ نہ پیے اور وہ یہ دودھ اپنے بچوں کو پلاتا ہے۔ یہ سن کر جنگلی گائے سخت حیران ہوئی۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد گھریلو گائے جنگلی گائے سے دوبارہ مخاطب ہوئی کہ کیا وہ اسے اس جنگل سے نکلنے کا راستہ بتا سکتی ہے تا کہ وہ اپنے مالک کے پاس چلی جائے۔

جنگلی گائے نے اس دفعہ غصے سے جواب دیا، تم جیسی غلامانہ ذھنیت والی گائے کو جو ظلم سہہ کر چپ ہے اور اس ظلم کا دوام چاہتی ہے میں مزید دیکھنا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ کہہ کر جنگلی گائے وہاں سے چلی گئی۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے اور جہاں تک ہو سکے انسان کو اپنی آزادی کا سودا نہیں کرنا چاہیئے۔ کم وسائل کی زندگی جو آزادی میں بسر کی جائے وہ اس زیادہ وسائل والی زندگی سے بہتر ہے جو انسان کی آزادی کو سلب کرنے والی ہو۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں

"اے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی"

انسان لاہوتی پرندہ ہے۔ یہ اس زمین کا پرندہ نہیں ہے بلکہ لاہوت کا یعنی اگلی دنیا کا پرندہ ہے۔ ایک روحانی دنیا کا پرندہ ہے۔ اس لاہوتی کو چاہیے کہ اپنے لیول پر کھڑا ہو کر اپنے معاملات کرے یعنی رزق کے حصول کا ایسا ذریعہ یا زندگی بسر کرنے کا ایسا طریقہ نہ اپنائے جس سے اس کے لاہوتی سٹیٹس میں فرق آئے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

"پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن"

فرماتے ہیں کہ ایک قلندرانہ زندگی ہے جس میں انسان محض وسائل اور آسائش کے حصول میں اپنی خودداری کو ضائع نہیں کرتا۔ وہ ایک خوددار آدمی ہوتا ہے اگرچہ اس کو کم وسائل اور کم آسائشیں حاصل ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی ذات میں مگن ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں جب بندہ غیر کے آگے جھکتا ہے تو پھر غلام بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایک آزاد، آسان اور بامقصد زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اے ٹی ایم ATM

متن حکایت۔

ایک آدمی اے ٹی ایم کے بوتھ میں داخل ہوا تو اس کی چھوٹی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ بچی کو شوق تھا کہ وہ بھی دیکھے کہ ATM سے پیسے کیسے نکلتے ہیں۔ اس نے کارڈ داخل کیا پاس ورڈ دیا اور جھٹ پیسے مشین سے باہر آ گئے۔
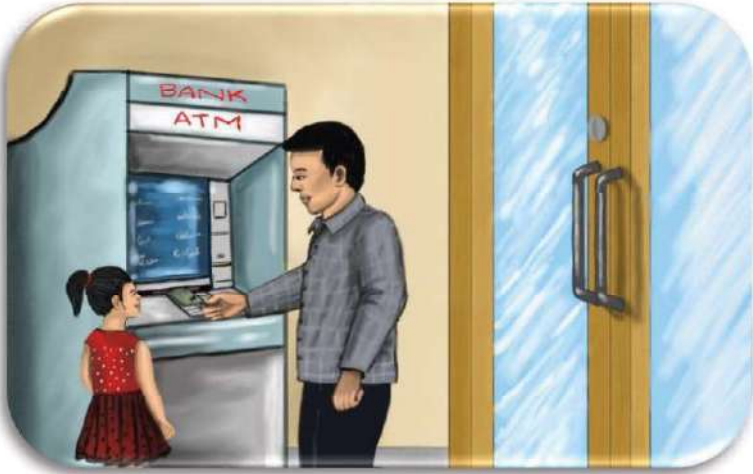
بچی نے یہ دیکھا تو اپنے پاپا سے بولی آپ خوامخواہ مجھے کھلونے لینے سے منع کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے لیے کیا مشکل ہے جب چاہیں ATM سے جتنے مرضی پیسے نکال لیں۔ بچی کا ذہن ابھی چھوٹا تھا اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ بندہ کتنے مراحل سے گزرتا ہے تب جا کر اپنے حصے کے پیسے ATM سے نکال سکتا ہے۔

شرح حکایت۔

ہم نے اس حکایت میں رزق کی ظاہری تقسیم کے حوالے سے اشارہ کیا ہے یعنی انسان کا رزق بظاہر تو ایک راستے سے حاصل ہو رہا ہوتا ہے لیکن اس کے پیچھے ایک طویل نظام ہے—ایسے ہی جیسے اے ٹی ایم مشین سے پیسے باہر آجاتے ہیں لیکن وہ پیسے اے ٹی ایم مشین تک کیسے پہنچتے ہیں اس میں انسان کی محنت کے بے شمار مراحل شامل ہوتے ہیں۔ اس حکایت کو ایک اور طریقے سے بھی سمجھ سکتے ہیں- آدمی کی جسمانی طور پر اپنے ماں باپ کے جینز سے گروتھ ہوتی ہے۔ بیشتر اوصاف بھی جینز کے ساتھ ٹرانسفر ہوتے ہیں—اس کے علاوہ اس کی اپنی روحانی استعداد ہے کہ وہ کس استعداد کی حامل روح ہے۔یوں یہ جسم اور روح سے مرکب ایک انسانی اے ٹی ایم کارڈ ہے۔ جس طرح اے ٹی ایم کارڈ کی استعداد ہوتی ہے کہ وہ کتنے پیسے نکال سکتا ہے—ایسے ہی جسم اور روح سے مرکب انسان کی ایک متعین استعداد ہوتی ہے۔تاہم انسان کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ جو بھی وراثتی استعداد لے کر پیدا ہوا ہے، اپنی اس زندگی میں اس وراثتی استعداد کو یہاں کی ریاضت، عبادت اور محنت کی ساتھ بہتر بنائے۔

ایک اے ٹی ایم کارڈ کا حامل آدمی مختلف قسم کے کاروبار میں شامل ہو کر اپنے بنک اکاؤنٹ میں مزید ڈپازٹ رکھوا سکتا ہے اور یوں اس کے اے ٹی ایم سے پیسے نکلوانے کی استعداد بڑھ سکتی ہے۔اس کے علاوہ وہ کارڈ پر دیئے ہوئے نمبر سے اپنے بنک سے رابطہ کر سکتا ہے اور اپنی استعداد کے حوالے سے بنک سے کسی سہولت کا طلب گار ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی جو انسان دنیا میں آیا ہے وہ محنت، عبادت، محبت اور انسانیت کی خدمت کے ٹولز استعمال کر کے اپنے رب سے تعلق قائم کر کے رحمت، منفعت اور مغفرت کا طلب گار ہو سکتا ہے۔

توری اور کریلے کی بیل

متن حکایت۔

ایک کھیت میں توری اور کریلے کی بیلیں ساتھ ساتھ بڑی ہو رہی تھیں۔ ان کی نئی نئی ٹہنیاں اور پتے آپس میں گڈ مڈ تھے جیسے دونوں بیلیں بانہوں میں بانہیں ڈال کر آگے بڑھ رہی ہوں۔ کچھ عرصے بعد دونوں بیلیں جوان ہو گئیں اور ان پر پھل آنے کا وقت آگیا۔

کریلے کی بیل پہ کریلے آئے اور توری کی بیل پہ توریاں۔ جب توریوں نے دیکھا ان کے ہم جولی کریلے کڑوے ہیں تو بچپن کی دوستی اور گرم جوشی ماند پڑنے لگی۔
کچھ ہی دن بعد مزاج کے اختلاف سے توریوں اور کریلوں کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔

شرح حکایت۔

دراصل ہم اس حکایت میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لوگوں کے بظاہر ایک جیسے نظر آنے کے باوجود ان کی فطرت اور عادات میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ان کی جینیاتی وراثت کی

وجہ سے بھی ہوتا ہے اور ان کی انفرادی روحانی حقیقت کے اعتبار سے بھی یعنی انفرادی روحیں انسانی جسم میں آنے سے پہلے عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کی شہادت دینے کے اعتبار سے تو ایک ہیں لیکن وہ اپنی ممکنہ ذوات کے حوالے سے ایک دوسرے سے متفاوت ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں (وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ سورۃ بلد آیت 10) اور ہم نے اسے دو راستے دکھائے۔

اس طرح لوگ اپنی ممکنہ استعداد کے ساتھ سعادت اور شقاوت والے راستوں پر چل پڑتے ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے انبیاء معبوث فرمائے اور آسمانی کتابیں نازل کیں تاکہ لوگوں کو سیدھے راستے پر ہدایت ملے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ہدایت پر عمل کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں سیدھے رستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

غار

متن حکایت۔

دورستان گاؤں ایک سیدھے اونچے پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔گاؤں میں کھڑے ہو کر اس پہاڑ کے اوپر تک دیکھنے کے لیے گردن سیدھی آسمان کی طرف بلند کریں پھر کہیں جاکر اس پہاڑ کی چوٹی نظر آتی ہے۔
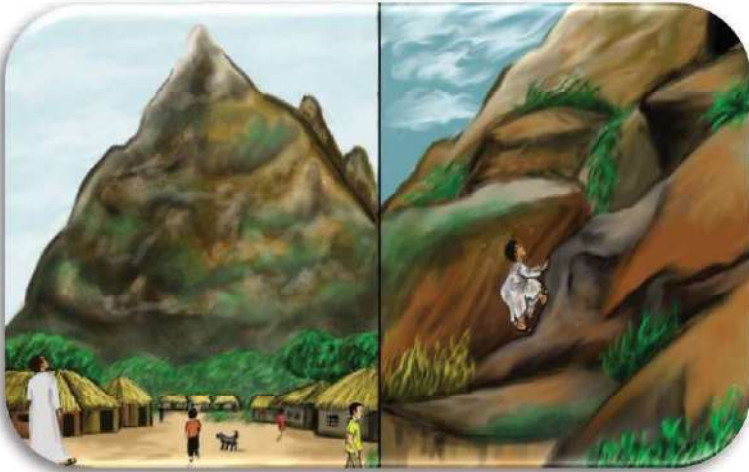
گاؤں میں مشہور تھا کہ دورستان کے اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار واقع ہے جس میں خدا کا ایک ولی رہتا ہے۔وقتاً فوقتاً کئی لوگوں نے اس پہاڑ کی اونچائی پر واقع غار میں پہنچنے کی کوشش کی تاکہ اللہ کے اس ولی کا دیدار کر سکیں لیکن وہ اس مشکل ترین منزل کو سر کرنے میں ناکام رہے۔

اب یہی شوق دورستان کے ایک نوجوان بیدار خان کے سر چڑھ کے بول رہا تھا۔

اس نے تمام تر مخالفت کے باوجود اس پہاڑ پر چڑھ کر غار کو دیکھنے اور اللہ کے ولی سے ملاقات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

چناچہ وہ ایک دن علی الصبح اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ کٹھن تھا اور تنہائی اور وحشت اس کے لیے کئی طرح کے مصائب کا باعث تھی۔ وہ گرتا پڑتا چلتا رہا۔ پہاڑی پر چڑھنا کچھ آسان نہیں تھا لیکن اس کے شوق کے آگے یہ سب جیسے آسان ہو گیا تھا۔

اس کا سفر کئی دن اور راتوں کا تھا۔ وہ تھکا، گرا زخمی ہوا لیکن چلتا رہا۔ اس نے کئی طوفانوں کا مقابلہ کیا۔ پہاڑی رستے میں کئی راتیں بسر کیں لیکن اس کے عزم میں کوئی خلل نہ آیا۔

وہ کئی دنوں کے کڑے سفر کے بعد پہاڑ میں اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ اس کو غار نظر آنا شروع ہو گیا۔ اس کو امید لگی کی اب ایک آدھ دن میں وہ غار کے منہ کے سامنے ہو گا اور پھر اس کی اللہ کے ولی سے ملنے کی دیرینہ آرزو پوری ہو جائیگی۔

اس کا چہرہ دھول سے اٹا ہو تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ اور پاؤں کانٹوں اور پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو گئے تھے۔ سر کے بال الجھے ہوئے اور داڑھی اور مونچھیں بے ہنگم بڑھی ہوئی تھیں۔ اس سب کے باوجود اس کا دل روشن تھا اور غار کے منہ میں پہنچ کر اللہ کے ولی کو پا لینے کا شوق اسے کسی چراغ کی طرح روشنی دے رہا تھا۔

وہ مسلسل غار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں پر نور تھیں۔ وہ غار کے بہت قریب ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکا تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ وارفتگیِ شوق میں بھول گیا کہ آیا وہ غار جس کی طرف وہ بڑھ رہا تھا اس کے سامنے واقع تھی یا پھر اس کے دل کے اندر۔

وہ اچانک پھسلا اور نیچے کی طرف لڑھکا۔ لڑھکتے لڑھکتے وہ ایک درخت سے ٹکرا کر پہاڑی پر ایک جگہ رک گیا۔ اس اچانک لڑھکنے اور جھٹکے کھانے سے اس کے اندر ایک گہری روشنی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ غار جس کو وہ پہاڑ کی چوٹی پہ تلاش کر رہا تھا، خود اس کے دل کے اندر موجود تھی۔ اس نے جی بھر کر اپنے دل میں موجود غار اور اللہ کے ولی کا نظارہ کیا۔

وہ سراپا روشنی ہو چکا تھا۔ اس روشنی کے ساتھ وہ واپس گاؤں کی طرف عازمِ سفر ہوا جہاں لوگ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت کی پوری تشریح پر تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن میں اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کے کچھ خاص پہلوؤں پر ہی نظر ڈالوں گا۔

اس حکایت میں غار کو انسان کے قلب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ قلب کو انسان کی روحانی شخصیت کا مرکزی عضو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ قلب کا تزکیہ پوری شخصیت کا تزکیہ ہوتا ہے۔ قلب ہی وہ مرکز ہے جس میں انوارات و معارف الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ انسان کا دماغ ایک جزوی عقل کی حد تک خوب کام کرتا ہے۔ لیکن قلب کی وسعت اور رسائی دماغ سے بہت بڑی ہوتی ہے۔ قلب حقائق علویہ کے ساتھ کچھ ایسے تعلق قائم کرتا ہے جو دماغ کے بس کی بات نہیں۔

اس حکایت میں دورستان سے مراد انسان کا حقیقت اعلیٰ سے دور واقع ہونا ہے۔ یہ دوری اور فاصلہ ہی ہے جو جہالت اور ظلمت کا باعث بنتا ہے اور ہم انوار و برکات سے محروم رہ جاتے ہیں۔

اس حکایت میں بیدار خان سے مراد وہ شخص ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ دورستان میں واقع ہے اور پھر اس دوری کو جو اس کی ابدی زندگی کے حصول میں رکاوٹ بن رہی ہے ختم کرنا چاہتا ہے۔ یوں وہ سامنے آنے والے ہر پہاڑ پر چڑھنے کے لیے تیار ہوتا ہے جس پر چڑھ کر وہ اس غار میں داخل ہو سکے جو انوار و برکات سے معمور ہے۔ یعنی اپنے قلب پر موجود ہر اس غلاف کو اتار پھینکے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان حائل ہو کر اس کے لیے جہالت، غفلت اور دوری پیدا کر رہا ہے۔

ڈش انٹینا

متن حکایت۔

ایک نوجوان نے ڈش انٹینا خرید کر اپنے گھر کی چھت پر نصب کیا۔ تاکہ وہ ڈھیر سارے سیٹلائیٹ چینل اپنے ٹی وی پر دیکھ سکے۔

وہ رات کو ریموٹ لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور چینل آگے پیچھے کرتا رہتا۔ سینکڑوں چینل اس کے سامنے ہوتے اور وہ مسلسل ان کو بدلتا رہتا۔
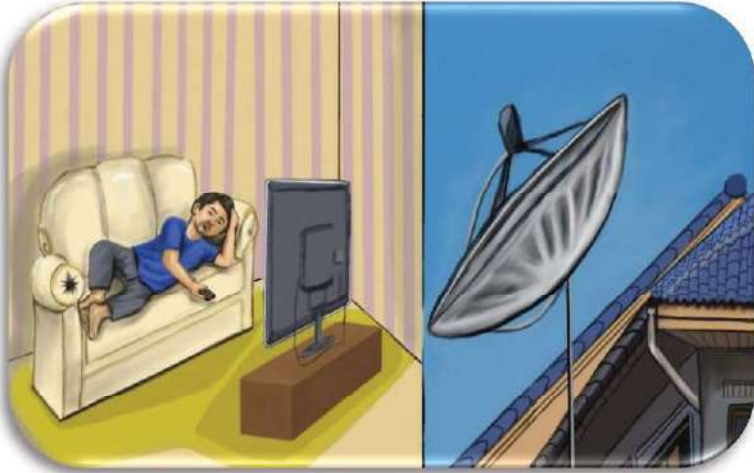
وہ کسی ایک چینل پر پوری توجہ مرکوز نہ کرتا۔ اکثر ایسے ہی چینل بدلتے بدلتے اسے نیند آجاتی اور وہ سو جاتا۔ اس کی طبیعت میں ارتکاز کی کمی کی وجہ سے سیٹلائیٹ چینلز کی بھر مار اسے کوئی فائدہ نہ دے سکی۔

شرح حکایت۔

یہ کائنات بہت وسیع و عریض ہے اور انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اس پوری کائنات کا احاطہ کر سکے۔اس پوری کائنات کے سگنلز کو موصول کر سکے، کیونکہ ایک کمزور انسان کے مقابلے میں یہ کائنات بہت وسیع ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک ڈش انٹینا جب کسی سیٹلائیٹ سے کنکٹ ہوتا ہے تو اس کی رینج میں سینکڑوں چینلز ہوتے ہیں۔ایک آدمی کے بس میں نہیں ہوتا کہ وہ ہر چینل کو دیکھ کر اپنے لیے معلومات کا ذریعہ بنا سکے۔ وہ ایک وقت میں کسی ایک چیز پر ہی فوکس کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ میں فرمایا ہے الحمد اللہ رب العالمین۔ عالمین عالم کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ عالمین کا رب ہے اور ہم ان عالموں میں سے کسی ایک عالم میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے ذہن اور قلب کے اندر سگنلز کو موصول کرنے کی بس ایک حد تک ہی استطاعت ہے۔

کائنات کی ہر چیز آپ پر اثر ڈال رہی ہے اور آپ کو متاثر کر رہی ہے۔آپ اس کائنات سے خیال لے رہے ہیں۔۔ایسی صورت میں ایک ذہن ان سارے خیالات کی طرف، ان سارے سگنلز کی طرف توجہ مرکوز کرے تو یہ معاملہ اس کے لیے پیچیدہ تر ہوتا جائیگا۔

یہ تو کائنات کی بات ہے اس کے مقابلے میں اگر ہم خود انسان کو لیں۔ انسان بھی چونکہ ایک لمبے ارتقاء سے چلا آرہا ہے۔ اس کا جسمانی ارتقاء ہے، اس کا ذہنی ارتقاء ہے۔ انسان کن کن مراحل سے گزر کر یہاں پر پہنچا ہے اور یہاں سے آگے کن کن مراحل سے ہو کر جائے گا۔ یہ بہت بڑا رستہ ہے اس میں بہت بڑی پیچیدگی ہے۔ یہ ارتقاء کے اثرات بھی انسان کے ساتھ ہیں اور ان کے خلاصے پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح انسان کو دنیا میں بے شمار علوم سے واسطہ پڑتا ہے۔ لوگوں کے متنوع نظریات سے واسطہ پڑتا ہے۔ان سارے مسائل میں ہم کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں، کائنات کے حوالے سے ہماری اپروچ ہو یا اپنی ذات کے حوالے سے، ضروری ہے کہ ہم صرف خاص امور پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔

اگر ہم کسی سیٹلائٹ انٹینا کے سامنے بیٹھ کر ریموٹ سے چینل تبدیل کرتے رہیں اور اسی طرح چینلز بدلتے بدلتے رات کو سو جائیں یعنی اس دنیا سے چلے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک ایسی شخصیت کے ساتھ یہ دنیا چھوڑ کر جا رہے ہیں جو غیر یقینی صورت حال کا شکار ہے۔ غیر یقینی صورت حال میں دنیا سے چلے جانا اگلی زندگی میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔

ہم اپنی ذات کی پیچیدگی کو سمجھیں، اس کائنات کی پیچیدگی کو سمجھیں، اور اپنے لیے ہدایت کا ایک یقینی راستہ چنیں۔ جس طرح بے شمار قسم کے علم حاصل کرنے کے بعد کسی ایک علم میں اختصاص پیدا کرتے ہیں ایسے ہی ہمیں اپنی معرفت میں بھی اختصاص پیدا کرنا چاہیے۔ کہ میری ذات اصل میں کیا ہے، میری ذات کا تزکیہ کیا ہے، میری ذات کا عرفان کیا ہے اور پھر میرا، کائنات اور میرے رب کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

ساری عمر غیر یقینی علم و معرفت کے ساتھ نہیں گزاری جا سکتی۔۔اپنے ایمان کو ایک خاص لیول پر پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم علم اور معرفت کے خالص، متعلقہ اور واضح اصولوں پر فوکس کریں۔

عمارت

متن حکایت۔

ایک معمار نے انتہائی مضبوط عمارت تعمیر کی۔ اس میں خوب سریا اور سیمنٹ کا استعمال کیا۔

عمارت کی بنیادیں، کالمز، بیمز اور چھتیں کنکریٹ کی بنائی گئیں۔ جب یہ عمارت ہر طرح سے تیار ہو گئی تو ایک آدمی نے یہ گھر خریدا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ یہ لوگ اس عمارت میں رہتے، کھاتے پیتے، ہنستے گاتے اور ہر طرح کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے۔

ایک دن اس عمارت کے ایک کالم نے اپنے سر کے اوپر والی بیم سے کہا کہ بی بی بیم میں تو تمہارے اور چھت کے وزن کو اٹھا کر ہر وقت مستعد کھڑا ہوں لیکن یہ دیکھو اس گھر کے لوگ کتنے مست ہیں۔

انہیں کچھ فکر ہی نہیں کہ اس عمارت کا کوئی بنانے اور وزن اٹھانے والا بھی ہے۔

شرح حکایت۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

(مَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى

(سورہ احقاف آیت 3)

ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ اور ایک مقررہ مدت تک بنایا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا ہے

(اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ

(سورہ مومنون آیت 115)

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار بنایا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

اس حکایت میں یہ یاددہانی کروائی گئی ہے کہ یہ کائنات اکبر اور خود انسان کے اندر موجود کائنات اصغر مسلمہ اصولوں پر قائم ہیں۔ یہ باہر کی بڑی اور اندر کی چھوٹی کائنات ایک بہت بڑے خالق کی زبردست تخلیق ہیں۔ انفس اور آفاق ہر دور میں رہتے ہوئے انسان کو پوری طرح ہوشیار اور متوجہ رہنا چاہیئے ۔ان دونوں کائناتوں کے انتظام اور انصرام کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور اولیاء عظام کے ارشادات کی روشنی میں غور سے سمجھنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیرونی کائنات اور انسان کے اندر کی اندرونی کائنات ایسے ہی بے کار پیدا نہیں کیں بلکہ یہ اپنے اندر ایک گہرا انتظام اور منظم منصوبہ لیے ہوئے ہیں۔

ہمیں اپنی ذات کے مقاصد کو کائنات کے نظم اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ڈالنا چاہیئے تاکہ ہم اپنی ہدایت اور اخروی کامیابی کا سامان کرسکیں۔ مبادا کہ ہم اس گردش ایام میں اپنے آپ کو بھی بھول جائیں اور یہ زمین ہمیں اپنے اندر ہی دھنسا لے جائے۔

فاسٹ فوڈ

متن حکایت۔

ایک شہر میں فاسٹ فوڈ کی دکان کھلی۔ دکان کو سرخ اور پیلے رنگوں سے خوب سجایا گیا جو دیکھنے والوں کی اشتہاء میں اضافہ کرتے تھے۔ خصوصاً نوجوان اس فاسٹ فوڈ میں بہت کشش محسوس کرتے تھے وہ جوق در جوق آتے اور اس فاسٹ فوڈ سے لطف اندوز ہوتے۔

کچھ شہر کے لوگ جن میں اطباء بھی شامل تھے، وہ اس فاسٹ فوڈ کے ناقد تھے۔ ان کے خیال میں اس تمام رنگینی اور کشش کے باوجود جو کہ اس فاسٹ فوڈ میں تھی، یہ خوراک صحت کے لیے مفید نہیں تھی۔ یہ ناقدین اس بات پہ مصر تھے کہ نوجوان نسل یہ خوراک کھا کر عنقریب امراض کا شکار ہو جائیگی۔

شہر کے لوگ دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے، ایک وہ جو رنگینی اور کشش کو اصل سمجھے اور اسی کے اسیر ہو کر رہ گئے اور دوسرے وہ جو معاملہ فہم تھے انہوں نے دور تک سوچا اور اس رنگینی اور کشش کے پیچھے چھپے امراض کی تہہ تک پہنچ گئے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں بیان کیے گئے چند حقائق کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

فاست فوڈ سے مراد ایسے تمام نظریات اور عقائد ہیں جو جلدی میں اختیار کر لیے گئے ہوں جن کی بنیاد محکم نہ ہو اور جن کو اختیار کرنے میں پوری طرح چھان بین نہ کی گئی ہو اور نہ ہی ان کو زیرک لوگ مناسب اور متوازن سمجھتے ہوں۔

سرخ اور پیلے رنگوں سے مراد کسی شخص، چیز، خیال یا نظریے کی اوپری چمک دمک ہے یہ اوپری چمک دمک کشش رکھتی ہے اور لوگ اس طرف کھنچے چلے آتے ہیں لیکن آخر الامر پتا چلتا ہے کہ انسان ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا گیا۔

نوجوان طبقے کا خاص طور پر فاسٹ فوڈ کی طرف متوجہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ علم کی کمی، عقل اور شعور کی ناپختگی اور جذبات کے تابع ہونے کی حالت میں انسان جلد مختلف قسم کی چمک دمک کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی اور آخرت کے حقائق سے لاعلم رہنے پر نادم نہیں ہوتا اور فوری سامنے حاضر ہونے والی علمی اور نظریاتی فاسٹ فوڈ کا ہی عادی ہو جاتا ہے۔

شہر کے لوگوں کا دو طبقوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری عمل ہے کچھ لوگ معاملہ فہم ہوتے ہیں اور کچھ زندگی اور آخرت کے حقائق سے غافل رہتے ہیں۔ معاملہ فہم لوگ جانتے ہیں کہ وہ لوگ جو آسمانی حقائق سے غافل ہیں وہ اپنے لیے ناکامی کا سامان کر رہے ہیں—

وہ لوگ جو سمجھ جاتے ہیں کہ ظاہری چمک دمک اور افکار و نظریات کی فاسٹ فوڈ مخلوق کے لیے نقصان دہ ہے انہیں چاہیے کہ وہ لوگوں کو افکار و نظریات کی متوازن خوراک کی تعلیم دیتے رہیں تا کہ انسانیت کا سفر مسلسل ترقی کی طرف بڑھتا رہے۔

متن حکایت۔

اسلم جلدی سے اٹھا، نہانے کے لیے باتھ روم گیا، بھاگ کر کپڑے پہنے۔ بیگم ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بریڈ کا ایک توس منہ میں ڈالا، چائے کا کپ اٹھا کر دو گھونٹ بھرے اور باہر کی طرف دوڑا۔ بیگم نے پیچھے سے آواز لگائی ناشتہ تو پورا کر لیتے۔ اس نے کہا ٹائم نہیں ہے گاڑی نکل جائے گی۔

یوں وہ بھاگم بھاگ دفتر پہنچا۔ دفتر میں ایک سے بڑھ کر ایک نئی الجھن اس کے سامنے کھڑی تھی۔ سب سے بڑھ کر افسرانِ بالا کا رویہ جو اسے بالکل نہیں بھاتا تھا۔ سارا دن دفتر میں کام کرتا رہا اور واپس گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ گھر آ کر اس نے کھانا کھایا اور ساتھ ہی سونے کا ٹائم ہو گیا۔ سونے سے پہلے اس نے سوچا کہ یہ روٹین اس کی زندگی کو کھائے جا رہی ہے۔

اگلی صبح جب وہ اٹھا تو تازہ دم نہیں تھا۔ رات سونے کے باوجود پچھلے دن کی تھکان نہیں اتری تھی۔ وہ صحن میں آیا، موسم کافی صاف تھا۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت چڑیا اڑتی ہوئی امرود کے پیڑ پر آ کے بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک اور اڑان لی اور پھولوں کی کیاری کے پاس آ بیٹھی۔ پھر اس نے کیاری کے پاس کھڑے پانی میں ڈبکی لگا کر اپنے پروں کو جھاڑا، ایک اور اڑان بھری اور دوبارہ پیڑ کی شاخ پر جا بیٹھی۔

اسلم کو چڑیا کی اس حرکت میں بہت سکون اور ٹھہراؤ محسوس ہوا۔ وہ چڑیا کے پاس چلا آیا۔ اس نے چڑیا سے کہا تم بہت پر سکون لگ رہی ہو۔ مجھے تمہارے کسی کام میں عجلت اور گھبراہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ چڑیا نے کہا کیسی عجلت کیا گھبراہٹ۔ اسلم نے کہا مجھے روزانہ شدید مصروفیت میں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس مصروفیت میں صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم ایک چھوٹا سا پرندہ اتنا آزاد اور میں ایک دفتری کارندہ اتنا مصروف۔

چڑیا نے کہا تم انسانوں سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ ہم پرندے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر افسوس کرتے ہیں۔ لیکن تمہیں اس مادی چکر سے نکال نہیں سکتے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت میں ہم اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ایک فرد کی انفرادی زندگی اور قوموں کی اجتماعی زندگی میں معاشی تگ و دو اور سکون و راحت کا ایک خوشگوار تناسب ہونا چاہیے۔ ہر محنت اور تگ و دو کا لازمی نتیجہ سکون اور راحت ہونا چاہیے۔

مسلسل محنت اور کوشش کے بعد اگر انسان کو سکون اور راحت میسر نہ آئے تو ایسے میں اسے اپنی زندگی کے امور کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عام آدمی ہر اس چیز کے حصول کے لیے جسے اس جیسے باقی لوگوں نے حاصل کر لیا ہے دن رات لگا دیتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنی خوشیاں اور صحت بھی قربان کر دیتا ہے۔ ایسے ہی اقوام عالم ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں اس زمین کے ذرائع کا بے تحاشہ استعمال کرتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں انہوں نے اس سیارے کو طرح طرح کے ماحولیاتی مسائل کا شکار کر دیا ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى **الْاَرْضِ** هَوْنًا ۔

رحمن کے بندے زمین پر عاجزی اور آرام سے چلتے ہیں یعنی انہیں کسی قسم کی تیزی اور خواہ مخواہ کا رش نہیں ہوتا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے جسم کی زمین اور اس سیارے زمین پر آہستگی سے چلیں اور اپنی نفسیاتی اور روحانی زندگی کی پرورش کے لیے بھی وقت نکالیں تاکہ ہمارے اندر وہ صلاحیتیں بھی پیدا ہوں جو ہمیں آئندہ زندگی میں کامیاب کریں گی۔

بادشاہ کا باغ اور گائے

متن حکایت۔

ایک گائے کہیں سے بھاگتی ہوئی آئی اور شاہی باغ میں داخل ہو گئی۔ وہ پھولوں کی کیاریوں میں گھسی اور رنگ برنگے پھولوں کو اپنے پاؤں سے مسل دیا۔

` وہ سامنے آنے والے پودوں کے پتوں کو اپنے منہ میں ڈال کر کتر دیتی۔ اس نے سبز گھاس کے لانوں میں دوڑ لگائی اور گھاس کے میدانوں کا حسن اپنے پاؤں تلے روندا۔

وہ پانی کے فواروں کی طرف بڑھی، پانی کے تالابوں میں سے گزری اور کئی فواروں کے منہ اس کے جسم سے ٹکرا کر ٹوٹ گئے۔

یہ سب دیکھ کر باغ کے دربان اس گائے کی طرف دوڑے تاکہ شاہی باغ کو اس نقصان سے بچایا جائے۔ جلد ہی دربان اس گائے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ باغ کو کافی نقصان پہنچ چکا تھا اور بادشاہ اس سارے معاملے پر بہت غصے میں تھا۔

شرح حکایت۔

ایک باغ ہمارے جسموں کا ہے جس میں ہماری ذمہ داری ہے کی ہم اپنی صحت کی حفاظت کریں— اگر ہم ایسا نہیں کریں گے اور یہاں توڑ پھوڑ کریں گے تو جسموں کا مالک ہمیں اس باغ سے نکال دے گا۔

ایک باغ ہماری روحوں کا ہے اگر ہم اعلیٰ اخلاقیات کے ساتھ اس باغ کی آبیاری نہیں کریں گے تو اس باغ میں توڑ پھوڑ ہو گی جو روحوں کے بادشاہ کو پسند نہیں۔ ایسے میں وہ ہمیں اس باغ سے نکال باہر کرے گا جو ہماری ہمیشہ کی ناکامی کا باعث بنے گا۔

اسی طرح اس زمین کا باغ ہے جس میں ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ماحولیات کی حفاظت کریں۔ جیسے پانی ضائع نہ کریں، شجرکاری کو بڑھائیں۔ ورنہ یہ زمین ہم سے ناراض ہو جائیگی اور ہم اجتماعی طور پر عذاب کا شکار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی زندگی سے متعلق تمام باغوں کی حفاظت کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

متن حکایت۔

کسی گاؤں میں دینو نام کا ایک آدمی رہتا تھا. اس کے پاس ایک گدھا تھا جس کا وہ بہت خیال رکھتا تھا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ گدھا بیمار ہو گیا۔ چونکہ دینو کو گدھے سے بہت محبت تھی اس لئے اس کی بیماری دینو کو پریشان کرنے لگی۔

دینو نے اپنی بیوی کو بتایا کہ اگرچہ وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو اس پریشانی سے بچائے لیکن پریشان ہونے والا ذہن اس کے قابو میں نہیں آتا۔ اس کی بیوی نے اسے بتایا کہ یہ کام کافی محنت مانگتا ہے۔

دینو کو یوں لگتا کہ جیسے وہ تین ہیں۔ گدھا، دینو کا ذہن اور خود دینو؛ جو اپنے ذہن سے الگ بھی تھا اور اس کے مقابلے میں بھی کھڑا تھا۔

پھر ایک دن گدھا مر گیا۔ گدھے کے مرتے ہی گدھے کی طرف پریشان رہنے والا ذہن بھی مر گیا۔ یوں دینو اکیلا رہ گیا۔ لیکنُ گدھے کی محبت اور اس کی بیماری میں پریشان رہنے کے اثرات اس کی ذات کے ساتھ باقی رہ گئے۔

شرح حکایت۔

اس حکایت کے تین کردار ہیں۔

1۔ دینو

2۔ دینو کا دماغ یا ذہن

3۔ دینو کا گدھا

دینو سے مراد انسان کی روحانی شخصیت ہے جو اگرچہ جسم، ماحول اور تعلیم کے ساتھ جڑی ہوئی ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کا لیول ان چیزوں سے بلند ہو جاتا ہے یہ روحانی شخصیت قلبی جہت اپنا لیتی ہے اور ذہن میں اٹھنے والے رجحانات کو سپروائز کرنا شروع کر دیتی ہے۔ چونکہ یہ جسم اور ذہن سے الگ تر اپنا ایک مقام رکھتی ہے اس لیے جسم کے مرنے کے بعد اس کا اپنا وجود قائم رہتا ہے۔

دینو کے دماغ سے ہماری مراد انسان کی شخصیت کی وہ حالت ہے جس سے وہ عام طور پر خود کو منسوب سمجھتا ہے یعنی ساری عمر اپنے جسم کے ساتھ رہنے کے بعد اور اس دنیاوی زندگی میں خاندان، دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے اور تعلیم و تعلم کے حوالے سے جو اس کی شخصیت بنتی ہے وہ گویا اس کی پہچان ہوتی ہے اور یہ پہچان اس کے ذہن کا حصہ بن جاتی ہے۔

دینو کے گدھے سے ہماری مراد انسان کا جسم ہے جیسا کہ اکثر صوفیا نے روح کو سوار اور جسم کو سواری سے تشبیہ دی ہے۔

ڈینو کی غلطی کیا تھی۔ڈینو کی غلطی یہ تھی کہ اس نے گدھے کی محبت، بیماری اور اس کے مرنے کا غم اپنے ذہن میں اس شدت سے قبول کیا کہ اس کی روحانی شخصیت اس ذہنی غم سے پوری طرح آزاد نہ ہو سکی اور یوں مرنے کے بعد اس حوالے سے بدستور ایک کرب میں رہا۔

یعنی اگر ایک انسان اپنے آپ کو محض جسم کے ساتھ منسوب کرے اور اپنے جسمانی ذہن سے مسلسل اس عمل کا اثر لے تو ایک بلند روحانی شخصیت بننے کی بجائے جسم کے میلانات کے اندر ہی قید ہو جاتا ہے۔

کوااور چڑیا کے انڈے

متن حکایت۔

کسی جنگل کے بادشاہ نے حکم دیا کہ سب پرندے اپنی اپنی استعداد کے مطابق کچھ کھانے کا سامان شاہی خزانے میں جمع کروائیں تاکہ مشکل اوقات میں بادشاہ اس خوراک کو مستحق پرندوں میں تقسیم کر سکے۔

مقررہ دن پر بادشاہ نے دربار لگایا اور اس کے وزیر اپنے اپنے مقام پر بیٹھ گئے۔ ایک ایک پرندہ اندر آتا اور اپنے حصے کا سامان جمع کرواتا۔ کسی کے پاس روٹی کا ٹکڑا ہوتا، کسی کے پاس دانے ہوتے اور کوئی کچھ اور چیز اپنے منہ میں اٹھائے حاضر ہوتا۔

اسی جنگل میں ایک کوا بھی رہتا تھا۔ اس نے جب بادشاہ کا یہ اعلان سنا تو ایک درخت پر موجود چڑیا کے گھونسلے کو خالی پا کر اس میں گھس گیا۔ اس نے بیچاری چڑیا کے انڈے چرائے اور لا کر بادشاہ کو پیش کر دیے۔

وزیر نے بادشاہ کو بتایا کہ کوے نے چڑیا کے انڈے جمع کروائے ہیں۔ بادشاہ نے وزیر کو کچھ سرگوشی کی۔ وزیر نے دربار میں آکر کوے سے کہا کہ بادشاہ سلامت نے آپ کو شام کو دوبارہ پیش ہونے کا حکم دیا ہے۔

جب شام کو کوا دوبارہ دربار میں پہنچا تو شاہین نے جسے پہلے سے بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا ایک ہی وار میں اس کوے کا سر دبوچ لیا۔

اصل میں پرندوں کے بادشاہ کو کھانے کا سامان جمع کروانے کا یہ استحصالی رویہ بالکل پسند نہیں آیا تھا اور اس نے کوے کو یہ سخت سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

شرح حکایت۔

اس حکایت کی اگر معاشرتی لیول پر وضاحت کی جائے تو کوے سے مراد ایسے لوگ ہیں جو اگر کبھی کسی مقتدر کے ڈر سے کوئی نیکی کرتے بھی ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ کسی کمزور اور غریب کا استحصال بھی کر رہے ہوتے ہیں۔

اگر اس حکایت کی کسی ایک قوم یا ملک کے تناظر میں تشریح کی جائے تو پھر کوے کا طرز عمل ایسی قانون سازی کی طرف اشارہ ہے جس کے ذریعے چڑیا کے انڈے یعنی غریب عوام کا مال واسباب اس قوم کے امراء اور طاقتور لوگوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔

اور اگر اس حکایت کی تشریح بین الاقوامی تناظر میں کی جائے تو پھر وہ بین الاقوامی معاشی، سیاسی اور فوجی نظام مراد ہے جو صرف خاص اقوام کی خوشحالی برقرار رکھنے کے لیے کچھ دوسری اقوام کو پسماندہ رکھنے کا عہد کیے ہوئے ہو۔

اگر اس حکایت کی روحانی تشریح کی جائے تو کوے سے مراد خواطر نفسانیہ ہیں اور چڑیا کے انڈوں سے مراد مبتدی کے خواطر قلبیہ ہیں جو کہ خواطر نفسانیہ کی زد میں آجاتے

ہیں۔ کسی بھی سالک کی مسلسل کوشش اور تزکیہ ایک دن ضرور رنگ لاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے شاہینوں کے ذریعے ان کووں کا سر کچل دیتی ہے۔
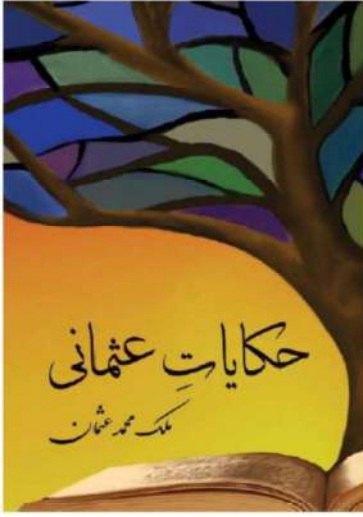
اشاعت ستمبر 2021
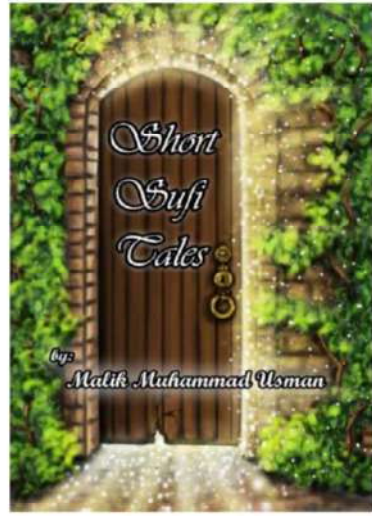
اشاعت اپریل 2022
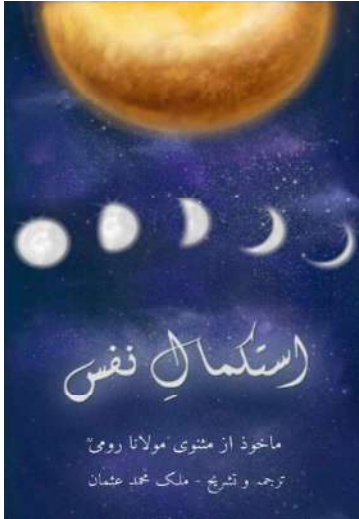
اشاعت اپریل2023

اشاعت اپریل 2023